جنوری۔ستمبر ۱۹۴۴ کوئی شمارہ
شائع نہیں ہوا

معاشیات، سیاسیات، اجتماعیات وغیرہ

		قیمت
ہندوستان کے [illegible] پر جنگ کے اثرات	محمد احمد خاں	
جنگ [illegible] کا مسئلہ	شفیق الرحمٰن	
جنگ [illegible] ہند	سعید احمد مینائی	
امریکہ [illegible] بین الاقوامی زر کے منصوبے	عطاء الرحمٰن علوی	
کینیڈا " " "	خواجہ شمس الدین	
انگلستان " " "	محمد احمد خاں	
ہندوستان " " "	سعید احمد مینائی	
حصول زائد نفع اندوزی	" "	
ہندوستان کا قومی قرضہ	محمد احمد خاں	
ہندوستان کے لئے ایک معاشی لائحہ عمل	سر پرشوتم داس، ٹھاکر داس	
معاشیات اور پاکستان	سید عبد القدوس ہاشمی	
ترکستانی خاتون شاہراہ عام پر	قدوس صہبائی بی اے (آنرز)	۱۲
بخارا کا جمہوری انقلاب	" "	۱۲
سیاست جاپان	علی امام بلگرامی ایم اے	
مرد انقلاب	شہزادہ کروپاٹکن کے حالات زندگی	۱۲
جنگ اور مالیہ	امتیاز حسین خاں بی کام (لندن)	۱۲
جنگ اور اغذیہ	" "	۱۵
اشتراکی روس	محمد عبد القادر لکچرار جامعہ عثمانیہ	
تنظیم مابعد جنگ	ڈاکٹر انور اقبال قریشی جامعہ عثمانیہ	
ماریشیائی طرز حکومت	منظور الحسن ہاشمی بی اے	۱۲
	شاہد حسین رزاقی ایم اے	
	عبد اللطیف اعظمی بی اے (جامعہ)	۱۲

مکتبہ جامعہ
دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی ۳

جامعہ

زیر ادارت: پروفیسر محمد عاقل ایم۔ اے

نمبر ۱	بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۴ء	سالانہ چندہ عہ فی پرچہ ۴ر

فہرست مضامین

[illegible]

فنونِ لطیفہ

تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو فنونِ لطیفہ صنعتوں کی اعلیٰ شکلیں ہیں جنہیں انسان کی محنت اور شوق، ذوق اور اولوالعزمی نے صنعتوں سے الگ اور برتر مرتبہ دیدیا۔ صنعتیں اس لیے وجود میں آئیں کہ انسان کو بہت سی مادی ضروریات مہیا کرنے اور زندگی کو آسان بنانے کی خواہش تھی۔ اس کی طبیعت میں شروع ہی سے حسن کی طلب اور تخلیق کی امنگ بھی تھی اس نے اپنی ضروریات کے لیے جو کچھ بنایا خوبصورت تھا۔ اس نے ہر کام کی چیز کی ایک موزوں شکل سوچی اور اسے رنگ اور نقش و نگار سے بھی کیا۔ ذہنی ارتقا کے ساتھ حسن کا ذوق لطیف ہوتا گیا، انسان نے محسوس کیا کہ گانے، ناچنے، خوب صورت چیزیں بنانے میں اس کی شخصیت اور زندگی کی ویسی ہی تکمیل ہوتی ہے جیسی درخت کی پھل لگنے سے۔ محض ضرورت پوری کرنا اسے کافی معلوم نہ ہوا، صنعتیں ترقی کرتی ہیں مگر ان کے والوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہونے لگے جو حسن کے تصور میں ڈوبے رہتے تھے اور اپنے احساسات دوسروں تک پہنچانے کی خاص استعداد رکھتے تھے الفاظ اور تصورات کا ذخیرہ بڑھ گیا اور انسان بے تکلفی سے اپنے مطالب ادا کرنے لگا۔ تو زبان تبادلۂ خیال کے علاوہ جذبات اور واردات قلبی کو ادا کرنے کا ذریعہ بن گئی اور فنونِ لطیفہ میں خوش گفتاری اور ادب کا اضافہ ہو گیا۔

ہم اس وقت ادب لطیف کو آرٹ کے دوسرے شعبوں کی بہ نسبت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اس کا رواج زیادہ ہے اور اس کا سمجھنا نسبتاً آسان معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت سے تصورات ایسے ہوتے ہیں جنہیں براہِ راست یعنی استعارہ اور تشبیہ کی مدد کے بغیر ظاہر کرنے کی زبان میں صلاحیت نہیں ہوتی، جیسے کہ جمالیات، قوت، حرکت وغیرہ، اور بہت سے آدمی ایسے ہیں جو اپنے ...

[illegible] کے پیرائے میں ادا نہیں کر سکتے، البتہ مخصوص شکلوں یا رنگوں، سروں یا جسم کی حرکتوں میں بیان کر سکتے ہیں۔ شاعر الفاظ کے ذریعہ اپنی کیفیت کو بیان کرتا ہے مصور رنگ اور شکل کے پیرائے میں [illegible] ماہر دل کی بات ساز یا آواز کی زبانی کہتا ہے سنگ تراش اسے مورت یا منبت کاری میں مجسم کر دیتا ہے۔ مگر شاعر، مصور، سنگ تراش سب ایک ہی چیز کو [illegible] طریقوں سے پیش نہیں کرتے۔ فنون لطیفہ کی ہر صنف کا اپنا الگ منصب [illegible] عظمت، استقلال اور حسن کو اس طرح ہم آہنگ کرنا جیسے کہ تاج محل [illegible] گیا ہے، شاعری، مصوری یا موسیقی کے بس میں نہیں، سیونٹ [illegible] ساکت چیز کو جس طرح دائمی حرکت کا نمونہ بنایا گیا ہے وہ سنگ تراشی کا حصہ ہے [illegible] نہیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ فنون لطیفہ کی کسی ایک صنف کو فضیلت حاصل ہے، اور یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ آدمی کو پورا آدمی، زندگی کو پوری زندگی بنانے کے لئے جمالیات کا ایسا ذوق اور ایسا چرچا لازمی ہے کہ ہر فن لطیف کا حق ادا کیا جا سکے۔ ہم آرٹ کی کسی صنف کو توجہ کے قابل نہ سمجھیں یا اس سے تعصب برتیں تو ان لوگوں کی تخلیقی قوتیں سلب ہو جائیں گی جو اس فن کو احساسات کا مظہر بنانے کی فطری صلاحیت رکھتے ہیں، اسی نسبت سے انسان کی طبیعت اور اس کے فکر کی تشکیل اور تکمیل کے امکانات محدود ہو جائیں گے، اور یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ زندگی جتنی محدود ہو اتنی ہی ناقص اور ناکام رہتی ہے۔

فنون لطیفہ کا ذوق انسان کی سرشت میں ہے۔ تہذیب کی پیدا کی ہوئی خصوصیت نہیں۔ اس کا ثبوت صرف یہ تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ انسان نے اس وقت سے جب کہ اسے اپنے اعضاء پر قابو ہو گیا رنگ اور شکل اور نغمے کو اپنا رازداں بنایا۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ انسان کو فنون لطیفہ کا اصل سرمایہ فطرت سے ملا ہے اور شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اس نے حسن کا معیار اپنی طرف سے نہیں بلکہ قدرت کے نمونوں کو دیکھ دیکھ کر قائم کیا ہے۔ اب علم طبیعات اس کی تصدیق کرتا ہے کہ مصور مختلف رنگوں کی جو تاثیر محسوس کرتا ہے وہ سائنس کے نقطۂ نظر سے صحیح ہے۔ جن سروں کو فن موسیقی کی بنیاد مانا گیا ہے وہ [illegible] میں سب سے زیادہ دور رس اور ممتاز ہیں۔ مصوری، سنگ تراشی اور [illegible] میں [illegible]

کی جو حیثیت ہے اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ علوم صحیحہ اور فنون لطیفہ کی اساس ایک ہی، البتہ جو فرق ہو وہ مقاصد کا ہی علم کے مدنظر صحت ہوتی ہے اور فن کا نصب العین حسن ہوتا ہے۔ علم چاہتا ہے کہ قدرت پر قابو پائے، فن چاہتا ہے کہ خود قدرت بن جائے یہ خصوصیت ساری دنیا کے فنون لطیفہ میں عام ہی۔ انسان ہمیشہ اور ہر جگہ ان رنگوں اور شکلوں اور سروں کی تلاش میں رہا ہے جو اس کے مافی الضمیر کو ظاہر کرسکیں اور اس کے دل کو تسلی دے سکیں، اور اس جستجو میں اسے بہت کچھ کامیابی قدرت کی دست گیری سے ہوئی ہی اُس نے پہاڑوں سے عظمت، میدانوں سے وسعت، پھول پتیوں سے سجاوٹ کے پہلے سبق سیکھے جانوروں کے مشاہدے سے جسم اور حرکت کے تعلق کو سمجھا، اور پھر جب اس میں اتنی استعداد ہوگئی کہ اپنے جسم کو پتھر یا کاغذ پر بنا سکے تو رنگ حرکتیں اور اشارے ہزار کیفیتوں اور اداؤں کے مظہر بن گئے۔

لیکن جیسے کہ ایک ماں کی گود میں پلے ہوئے بچے اپنی الگ صورت شکل اور طبیعت رکھتے ہیں ویسے ہی انسان کی مختلف نسلوں اور گروہوں کی اپنی سیرت اور اپنا الگ مذاق ہوتا ہی اور یہ آہستہ آہستہ قومی عادت بن کر اور پختہ ہوجاتا ہی۔ فنون لطیفہ پر قدرتی ماحول اور ضروری سامان کی کمی یا افراط کا بھی بہت اثر پڑتا ہی ان سب باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا ہی کہ مختلف قوموں نے کمال حسن کی منزل تک پہنچنے کے الگ الگ راستے اختیار کئے۔ یعنی انھوں نے حسن کا اپنا خاص معیار قائم کیا اور اسی کے مطابق وہ فنون لطیفہ کی تعلیم دیتی اور کارناموں کو جانچتی رہیں۔ وہ ایسا نہ کرتیں تو مذاق کی تربیت ناممکن ہوجاتی، لیکن چونکہ لوگ انھیں چیزوں کو پسند کرتے ہیں جنھیں دیکھنے کے وہ عادی ہوں اور حسن اور تناسب پیدا کرنے کے خاص طریقے ان کے ذہن نشین ہوجاتے ہیں اس لئے ان کا ایک عقیدہ سا ہوجاتا ہے کہ حسن کو اسی پہلو اور اسی نظر سے دیکھا جاسکتا ہے جس سے کہ وہ اسے دیکھتے ہیں۔ یہ تعصب کی ایک شکل ہے جس سے ہمیں بچنا چاہئیے ہم میں دوسری قوموں کے مذاق کی قدر کرنے یا نئے اثرات کو قبول کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو ہمارا اپنا معیار حسن، خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو، رفتہ رفتہ محض پیمائش کا آلہ بن جائے گا۔ تخلیق کا شوق اسی وقت پورا ہوتا ہے جب نئے خیال کو نئے طریقے پر پختہ

کا امکان ہو۔ آرٹ پر ہمیشہ کے لیے کسی ایک طرز کی تقلید فرض کردی جائے تو اس کا تخلیقی امنگوں سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور اس سے اتنی ہی تسلی حاصل ہوسکتی ہے جتنی کہ نقل یا چوری کرنے سے نصیب ہوتی ہے۔

آج کل ہم آرٹ کے متعلق عموماً صحیح رائے نہیں رکھتے اس لیے کہ ہم نے تنقید کے جو معیار مقرر کیے ہیں وہ بالکل غلط ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آرٹسٹ کا کام نقل کرنا ہے، ساز آواز کی نقل ہے۔ مصوری یا سنگ تراشی موجود نمونوں کی نقل۔ مگر ہم یہ نہیں کہتے کہ ہر شاعر کو بھی موجود نمونوں کی صحیح صحیح نقل کرنا چاہیے۔ اس کے برخلاف ہم شاعر سے مطالبہ کرتے ہیں کہ کوئی نئی بات نئے انداز سے کہے، یا شاعری کا حوصلہ نہ کرے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ درحصل ہم فنون لطیفہ کو انعالی نہیں سمجھتے، اور اگر ہم کسی مصور پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے شکل کو قدرت کے مطابق نہیں بنایا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہم مصوری کے منصب سے واقف نہیں ہیں یا یہ بھول جاتے ہیں کہ شاعری کی طرح وہ بھی احساسات کو ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے، عکس اتارنے کا فن نہیں۔ ہمارے معیار کی دوسری خامی یہ ہے کہ ہم نے یورپی آرٹ کے سو ڈیڑھ سو برس اور اسلامی آرٹ کے تین چار سو برس پرانے نمونوں کو کامل حسن کے نمونے مان لیا ہے اور ان سے انحراف کرنا ایک دائمی حقیقت سے انکار کرنے کے برابر جانتے ہیں۔ یہ بھی آرٹ کے منصب سے چشم پوشی کی دلیل ہے، یورپ کے لوگوں نے یہاں تک کہ انگریزوں نے بھی اپنے پرانے طرز کو چھوڑ دیا ہے حسن کے ہر شیدائی کو وہ اپنا ہم مذہب، حُسن کے ہر معیار کو وہ حقیقی مانتے ہیں، اور اس کے علاوہ انھوں نے ہر فن میں اس علم سے فائدہ اُٹھایا ہے جو انھیں اس عرصے میں حاصل ہوا ہے اسلامی آرٹ کا معیار بھی، جیسا کہ چاہیے تھا، ماحول۔ علم اور نئے تجربات سے اثر لیتا رہا۔ تعمیر کے جس فن نے تاج محل جیسا کامل نمونہ تیار کیا وہ ارتقا کی کئی منزلیں طے کرچکا تھا اور اس نے ہر منزل پر یادگاریں چھوڑی تھیں۔ غالباً اگر شاہجہاں کے خاندان میں فن تعمیر کا اتنا ہی بڑا قدرداں پیدا ہوتا اور اس کو تمام وسائل میسر ہوتے تو وہ اس فن کو کسی نئی راہ پر لگاتا۔ تاج محل سے بڑا تاج محل بنوانے کی مہمل کوشش نہ کرتا، اس لئے کہ یہ کسی اعتبار سے مناسب نہیں کہ ہم ایک کارنامے یا ایک دور کو ترقی

کی انتہا مان لیں اور کہہ دیں کہ اب آگے نقل کرنے کے سوا اور کچھ ہو نہیں سکتا۔ جب زندگی کا سلسلہ کسی مقام پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتا تو جمالیات کا معیار اور اس کی قدریں نئے اور بدلتے ہوئے احساسات اور واردات قلبی کی حامل ہونے سے کس طرح انکار کر سکتی ہیں

یہ قوموں کے زندہ ہونے کی ایک علامت ہے کہ ان میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں جو حسن کو دوسروں کی آنکھوں سے نہ دیکھیں، خود اس کے دیدار کے طالب ہوں، اور اپنے کام کو نئی اخلاقی قدروں اور تازہ قلبی واردات کا حامل بنائیں۔ یورپ میں انیسویں صدی کے نصف آخر سے اس وقت تک آرٹ کی ماہیت پر بحث جاری ہے، اور اس کے جاری رہنے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مصور، سنگ تراش، شاعر، ڈراما نویس، غرض ہر قسم کے آرٹسٹ اپنے فن کے ایسے نمونے پیش کرتے رہے ہیں جن کو جانچنے کے لیے نئے معیاروں کی ضرورت تھی، جو آرٹسٹ محض جدت کرنا چاہتے تھے وہ جدت کرکے رہ گئے، جو سچے آرٹسٹ تھے وہ اپنے خاص طرز کے امکانات کو آزماتے اور اس میں پختگی پیدا کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کا طرز خود معیار بن گیا انہوں نے تقلید کے مسلک کو اس لئے چھوڑا تھا کہ تقلید کرکے وہ اپنی شخصیت، اپنے مافی الضمیر کو ظاہر نہیں کر سکتے تھے اور اسی کو ظاہر کرنا وہ آرٹ کا منصب اور اپنا حق سمجھتے تھے آرٹسٹ کے حق کا یہ مطالبہ آزادی کے اس دریا کی لہر نہیں تھی جو اس وقت یورپ میں موجیں مار رہا تھا۔ فنون لطیفہ کی تاریخ سے اگر ایک طرف یہ بات واضح ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر جگہ حسن کا ایک خاص معیار تھا تو دوسری طرف یہ بھی ثابت ہے کہ فن کے وہ اصول جو اس معیار کی ترجمانی کرتے تھے، آہستہ آہستہ بدلتے رہے، اور آخر میں ایک زمانہ آیا جب کہ ان اصولوں کو ترک کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، اور آرٹسٹ اس پر مجبور ہوئے کہ ہر پرانے نقش کو مٹا کر حسن کی ایک بالکل نئی تصویر بنائیں

فنون لطیفہ کا ہر طرز جس کی پوری نشو و نما ہوتی ہیں بڑی منزلوں سے گذرتا ہے۔ پہلی منزل وہ ہوتی ہے کہ جب آرٹسٹ کا علم اور فنی استعداد اتنی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے خیال کو پورا پورا ادا کر سکے، لیکن خود خیال میں اتنا زور ہوتا ہے کہ اس کی خوبی فنی خامیوں کے باوجود ظاہر ہو جاتی ہے، جیسے کوئی

خوبصورت، تندرست بچہ بے ڈھنگا لباس پہنے ہو تب بھی پیارا لگتا ہی یہ فن کے بچپن کا زمانہ ہوتا ہی علمی اصطلاح میں ARCHAIC یعنی قدیمی یا ابتدائی دور کہلاتا ہی اور اس کے کام میں ایسا بھولا پن، بداہت اور سادگی ہوتی ہی کہ وہ آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ ارتقا کی دوسری منزل وہ ہی جب کہ آرٹسٹ اپنے فن میں ایسا ماہر ہوتا ہی کہ تخیل کی بلند پروازی لسے عاجز نہیں کر دیتی۔ اور اس کا تخیل اپنی طرز فن کا ایسا نکتہ شناس ہو جاتا ہی کہ لازمی پابندیوں کو خوشی سے قبول کرتا ہے۔ اس لئے اس دور کی خصوصیت فن اور تخیل کی ہم آہنگی، خیال اور خیال کو پیش کرنے کے طریقے کی ایک لطیف مناسبت ہوتی ہے۔ یونان اور روما کی تاریخ کے ایک خاص دور کے فنون لطیفہ میں سادگی اور نفاست، ضبط اور بلند آہنگی کی ایسی صحیح آمیزش پائی جاتی ہے کہ لسے معیار مان کر فن کے اس دور کو CLASSICAL یا کلاسکی کہا جاتا ہے۔ یہ عروج کا زمانہ ہوتا ہے اور اس میں عموماً فن کے تمام امکانات آزمائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد انحطاط لازمی ہے، کیونکہ وہ ذہنی قوتیں جن کی بدولت فن کی نشو ونما ہوتی ہے آہستہ آہستہ زائل ہو جاتی ہیں، آرٹسٹ کے سامنے معیاری کام کے نمونے اس افراط سے موجود ہوتے ہیں کہ اس کا تخیل ان میں اُلجھ کر رہ جاتا ہی اور اس کی طبیعت میں خود بخود یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ دوسروں نے جو کچھ کیا ہی اس سے بڑھ کر کچھ کر دکھائے۔ یہ جذبہ صحیح نہیں، اس لئے کہ آرٹسٹ کی نظر اپنے دل پر ہونا چاہیئے، اور دوسروں کے کام کا مطالعہ اسے صرف اس نیت سے کرنا چاہیئے کہ فن میں ملکہ پیدا کر سکے جب وہ دوسروں کے کام کو سامنے رکھ کر ان سے بازی لے جانے کا حوصلہ کرتا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ نقل کرتا ہے، اور اس سے جو نقصان ہوتا ہے اس کی تلافی کے لئے یہ کافی نہیں کہ نقل کو اصل سے بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انحطاط کے دور کا اصطلاحی نام بروک[۵] ہے اس میں آرٹسٹ کا نصب العین یہ ہوتا ہی کہ فنی مہارت کے کرشمے دکھائے، کام کو حد سے زیادہ پیچیدہ کر دیا جاتا ہے، سادگی تخیل کی بے مائگی، خلوص تربیت کی خامی سمجھی جاتی ہے۔ فن کے ماہر اور قدرداں دونوں مبالغہ پسند

---

[۵] ہسپانیہ اور فرانس میں اٹھارویں صدی میں آرائش کا ایک طرز رائج ہوا جو BAROQUE کہلاتا تھا۔ اس میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں کہ جو فن کے دور انحطاط کی خاص علامتیں ہیں۔

ہو جاتے ہیں اور تصنع کی ایک وبا پھیلتی ہے جس کے مہلک اثرات سے بچنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ زندگی اور فنون لطیفہ کے تصور میں کوئی بڑا انقلاب ہو۔ ایسے انقلاب ساری دنیا میں ہوتے رہے ہیں اور عمل کے لیے نئے میدان، حسن کے لیے نئی جلوہ گاہیں فراہم کرتے رہے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں بھی ہمیں فنون لطیفہ کے عروج اور زوال کے کئی دور ملتے ہیں۔ یہ اس کی علامتیں ہیں کہ کئی تہذیبوں نے ترقی کی، عروج پر پہنچیں اور پھر انھیں زوال ہوا ان کے حالات ہمیں کبھی کبھی کتابوں کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں لیکن کتابوں میں وہی درج ہے جو ان کے لکھنے والوں نے دیکھا یا سنا، یعنی صرف ظاہری باتیں جن سے تہذیب کے باطن کا پورا بھید نہیں کھلتا۔ ہم صرف کتابوں پر بھروسا کرنے کے بجائے اگر یہ ذہن نشین کرلیں کہ فنون لطیفہ کا مقصد انسان کی انسانیت کو ابھارنا اور شکل دینا ہے اور وہ تہذیبی خصوصیات کے اصل حامل ہوتے ہیں تو ان کا ہر نمونہ معلومات کا ایک خزانہ بن جائے گا، ہماری تاریخ جاگ اٹھے گی ہم اپنے پیش رووں کی نظر اور ان کے ذوق کی پوری قدر کرسکیں گے اور ہم پر واضح ہو جائے گا کہ ان کا معجز نگار ہاتھ بے جان چیزوں کو ایسی شکل اور وضع دے سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ان کے تصور حیات کی یاد تازہ رکھیں۔

ملّت اسلامیۂ دکن کی معاشی ترقی کے لئے ایک لائحہ عمل

ذیل کا مقالہ مجلس اتحاد المسلین حیدرآباد کے سالانہ جلسہ منعقدہ ورنگل میں پیش کیا گیا تھا اس کے تمہیدی حصے کو جس میں صاحب مقالہ نے یہ دکھلایا تھا کہ چونکہ اسلامی معاشی نظام بحیثیت ایک نصب العین ابھی وضاحت کا محتاج ہے اور اس کے حصول کے لئے مملکت اسلامی اور جمعیت اسلامی کا قیام لازمی ہے اس لئے اس نصب العین کو فی الحال عملی سیاست کا جز نہیں بنایا جا سکتا ہم نے گنجائش کی کمی کی وجہ سے حذف کر دیا ہے اور صرف اس حصے کو پیش کر رہے ہیں جس میں موجودہ حالات کے پیش نظر حیدرآباد کے مسلمانوں کے لئے معاشی اصلاح و ترقی کی تجاویز کو پیش کیا گیا ہے۔ منصوبہ بندی نے آج کل ایک مہتم بالشان اور معرکتہ الآرا مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ لیکن یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس پر مختلف مفاد کے نقطہ ہائے نگاہ سے اور مختلف طریقۂ کار کے پیش نظر غور کیا جا سکتا ہے۔ ہم ملک کے اہل الرائے حضرات کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ رسالہ جامعہ کے صفحات کے ذریعے تبادلۂ خیال فرمائیں تاکہ اس مسئلے کے مختلف تاریک پہلو روشنی میں لائے جا سکیں۔ مدیر

تمہید : حکومتِ سرکار عالی یا حکومتِ ہند کی جانب سے جو معاشی تجاویز اس وقت مرتب ہو رہی ہیں۔ بہ ظاہر ان کی ترتیب پورے ملک کے مفاد کے پیش نظر کی جا رہی ہے۔ لیکن واضح رہے کہ ان معاشی منصوبہ بندیوں سے سب سے زیادہ استفادہ وہی طبقہ اور فرقہ کرے گا جس کا موجودہ معاشی موقف مضبوط اور مستحکم ہو۔ ملک میں لاکھ بڑی صنعتیں ہوں لیکن اس سے استفادے میں ان مسلمانوں کا کیا حصہ ہو سکتا ہے۔ جن کی گرہ میں ان صنعتوں میں مشغول کرنے کے لئے ایک ٹکا تک نہ ہو مسلمان معاشی منصوبہ بندیوں کی ان تجاویز کو دیکھتے ہیں اور پھولے نہیں سماتے۔ لیکن افسوس کہ وہ نہیں جانتے کہ یہ معاشی منصوبہ بندیاں ان کے لئے ہیں یا کسی اور کے لئے ہیں۔ جب ان معاشی

تجاویز کو جامہ عمل پہنایا جائے گا تو ان پر ظاہر ہوجائے گا کہ وہ خوش آیند توقعات جو انھوں نے ان معاشی تجاویز سے باندھ رکھی تھیں۔ ایک خواب و خیال سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ بہت جلد یہ تلخ حقیقت بھی ان پر روشن ہوجائے گی کہ عصر حاضر کے اس کلیہ کے مطابق کہ اقوام کی معاشی برتری ہی ان کی سیاسی برتری کا ذریعہ ہے۔ اس ملک میں ان کی سیاسی برتری بھی دوسری ہمسایہ اقوام کی معاشی ترقی کے باعث ایک قصہ پارینہ ہوچکی ہے۔

اس لئے بحالات موجودہ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان جلد سے جلد اپنی معاشی حالت کی اصلاح کرکے ان معاشی تجاویز سے جو حکومت کی جانب سے نافذ اور روبہ عمل لائی جانے والی ہیں حتی الوسع بیشتر سے بیشتر استفادہ کریں۔ تاکہ اس طرح ان کی معاشی خوش حالی کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی برتری بھی محفوظ رہے۔ اور اپنے معاشی نصب العین کے حصول کے لئے اپنی توانائیوں کو محفوظ اور مجتمع کرسکیں۔

مسلمانان حیدرآباد کی موجودہ معاشی حالت

مسلمانان حیدرآباد کی معاشی ترقی اور اصلاح کی نسبت اصلاحی تجویز کو پیش کرنے سے قبل ان کی موجودہ معاشی حالت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس ملک میں بجز ان مٹھی بھر گزیٹیڈ عہدہ داروں کے جو رشتہ ملازمت سرکاری میں منسلک ہیں مسلمان عام طور پر ایسے پیشوں میں مصروف ہیں جن کو کسی طرح منفعت بخش نہیں کہا جاسکتا۔ اور جن کے معیار آمدنی کو مزدوروں کے معیار آمدنی سے بلند نہیں سمجھا جاسکتا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے دیگر طبقات کے مقابلے میں مسلمانوں کی قومی آمدنی (NATIONAL INCOME) کا معیار بھی بہت پست ہے مسلمانوں کے پاس نہ تجارت ہے نہ زراعت اور نہ صنعت و حرفت۔ یہی نہیں بلکہ حیدرآبادی مسلمان جتنا کماتا ہے۔ اتنا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی صرف کردیتا ہے۔ پس اندازی کے ذریعے اپنی آمدنی کو مزید پیدائش دولت کا ذریعہ بنانا وہ نہیں چاہتا۔ اس نے اپنی طرز معاشرت ہی کچھ اس نوعیت کی بنالی ہے کہ وہ اپنی آمدنی کے کسی جزو کو پس انداز نہیں کرسکتا وہ اپنی سکونت کے لئے قیمتی مکان اور عالی شان قصر تیار کرتا ہے جن کی نگہداشت بھی اس کی اولاد کے لئے تو کیا خود اس کے لئے بھی بسا اوقات دشوار ہوجاتی ہے۔ لاریب صحت مند زندگی کے لئے آرام دہ اور اچھے مکان کی ضرورت

ہے لیکن عالی شان محلات اور قصور ایک معاشی حیثیت سے پست قوم کے لئے تباہی اور ہلاکت آفریں ہیں۔ دارالسلطنت حیدرآباد کا مسلمان اس مرض میں خاص طور پر زیادہ مبتلا ہے۔ اس اسراف دولت کا افسوسناک نتیجہ یہ ہے کہ کروڑہا کی وہ دولت جو پیدائش دولت کے کاروبار میں مشغول کرنے کے لئے بہم دست ہو سکتی تھی گچ۔ مٹی اور چونہ کے انبار میں ضائع جارہی ہے

مسلمانوں کے خورد و نوش، لباس اور بود و باش کے طریقے بھی دیگر ہمسایہ اقوام کے مقابلے میں بہت زیادہ پیش خرچ واقع ہوئے ہیں۔ اس قسم کی غیر معاشی طرز بود و باش بھی مسلمانان حیدرآباد کی معاشی پستی میں مزید اضافہ کا موجب ثابت ہوتی ہے۔

سطور آئندہ میں ہم یہ بتلانے کی کوشش کریں گے کہ مسلمانوں کی معاشی ترقی اور خوش حالی کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں اور کس طرح حالات موجودہ سے بیشترین استفادہ کرکے حیدرآبادی مسلمان اپنی معاشی خوش حالی کے ساتھ ساتھ ملک میں اپنی سیاسی برتری کو قائم و مستحکم کرکے اپنا معاشی ——— اور اس کے ساتھ سیاسی ——— نصب العین حاصل کرسکتے ہیں۔

مسلمانوں کی معاشی منصوبہ بندی کے مقاصد | موجودہ وسائل سے بیشترین استفادہ کے حسب ذیل پانچ ذرائع قرار دئے جاسکتے ہیں۔

۱۔ مسلمانوں میں پس اندازی کی ترغیب و تشویق اور پس اندازی کے لئے سہولتیں مہیا کرنا اور مسلمانوں کی جانب سے عظیم سرمایہ کی فراہمی جسے پیدائش دولت کے کاموں میں مشغول کیا جاسکے۔

۲۔ مسلمانوں کو معاشی اعتبار سے ایسے منفعت بخش پیشوں میں مصروف کرنا جن سے ان کی قومی آمدنی کا معیار بلند ہو۔

۳۔ مسلمانوں میں پیشہ ورانہ تعلیم اور فنی تربیت کا عام کرنا تاکہ مسلمانوں میں کلیدی اور بھاری صنعتوں کے لئے ماہر دستکار اور اعلیٰ تربیت یافتہ کاریگر فراہم ہوسکیں۔

۴۔ مسلمانوں میں سائنٹفک تحقیقات کو عام کرنا تاکہ علوم جدید کے انکشافات اور اختراعات سے مسلمانوں کی صنعتی ترقی میں استفادہ کیا جاسکے۔

۵۔ مسلمانوں میں ایسی تربیت یافتہ جماعت فراہم کرنا جو اعلیٰ انتظامی قابلیت تنظیمی صلاحیت اور عملی تجربات سے وسیع تجارتی اور صنعتی کاروبار کو بہ حیثیت منتظم ومہتمم چلا سکے۔

پس اندازی پس اندازی ہی وہ چشمہ ہے جہاں سے شغل اصل کے لئے سرمایہ کے دریا پھوٹتے ہیں۔ جب کوئی قوم اپنی قومی آمدنی کو کلیتہً اغراض صرف دولت کے لئے وقف کردیتی ہے تو اس سے نہ صرف اس کی پیدائش دولت موقوف ہو جاتی ہے بلکہ اس کی قومی آمدنی کا معیار بھی پست تر ہونے لگتا ہے۔ جیسا کہ سطور بالا میں ہم بیان کرچکے ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ معاشی پستی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ اپنی آمدنی کو پس انداز کرکے اُسے مزید پیدائش دولت کا ذریعہ بنانا نہیں جانتے۔ ان کی اس غیر معاشی ذہنیت کو دور کرکے انھیں پس اندازی کی ترغیب دینے کا اس وقت نہایت موزوں موقع ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانۂ جنگ میں اختیاری پس اندازی (VOLUNTARY SAVINGS) کا ایسا مناسب موقع حاصل ہے کہ اس کی نوعیت ایک طرح کی جبری پس اندازی (COMPULSORY SAVINGS) کی ہوگئی ہے۔ موجودہ جنگ کے باعث اجناس خوردنی اشیائے مایحتاج اور ضروریاتِ زندگی کی دیگر مختلف اشیاء کی قیمتوں پر سرکاری نگرانی قائم ہوگئی ہے۔ اور حالات و موانعات جنگ کے باعث سامان تعیش کی درآمد یا تو قطعاً موقوف ہوگئی ہے یا ان میں انتہا درجہ کی کمی آگئی ہے اس صورت حال کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے لئے اپنی آمدنی کو حسب دل خواہ صرف کرنے کے مواقع بہت کم ہوگئے ہیں۔ حکومتیں تو قومی تعمیری اغراض کے لئے جبری پس اندازی کو قانوناً نافذ کیا کرتی ہیں لیکن موجودہ جنگ کے باعث ایسے موانعات معرض وجود میں آگئے ہیں کہ ہم اپنی آمدنی کے ایک معتد بہ حصہ کو بہ آسانی پس انداز کرسکتے ہیں۔ ضرورت صرف سہولتوں اور کسی قدر ترغیب کی ہے۔

اور یہ سہولت مسلمانوں کے لئے ملک کے گوشے گوشے میں بنکوں کے قیام کے ذریعے مہیا کی جاسکتی ہے۔ ہر بڑے قصبے میں یا کم از کم ہر مستقر تعلقہ پر ایک بنک مسلمانوں کی جانب سے قائم کیا جائے۔ ان بنکوں میں سے ہر بنک کے سرمائے کی اقل ترین مقدار ایک لاکھ روپے ہونی چاہیے۔ ہر مستقر ضلع پر ایک مرکزی بنک کا قیام عمل میں لایا جائے۔ ان مرکزی بنکوں کے سرمائے کا تعین مسلم آبادی کے تناسب سے کیا جاسکتا ہے قصبات اور تعلقات کے بنکوں کا ان ضلع واری بنکوں سے الحاق کیا جاسکتا ہے۔

یہ بنک کسی رقبہ میں تجارتی بنکوں کا کام دیں گے۔ کہیں ان کی انڈسٹریل بنکوں کی حیثیت ہوگی اور کسی جگہ یہ بنک محض قرضہ دہندہ کے فرائض انجام دیں گے۔

بنکوں کے قیام اور اُن کے منفعت بخش اور محفوظ اہتمام کے لئے مسلمان بنک کاروں اور منتظمین کی ضرورت پیش آئے گی۔ موجودہ صورت حال کے لحاظ سے ایسے مسلمان ماہرین بنک کاری ملک میں مفقود ہیں۔ لہٰذا ان کی فراہمی کے لئے ایک تربیتی جماعت کے قیام کی ضرورت ہوگی۔ جہاں ماہرین معاشیات و بنک کاری کے مرتب کردہ مناسب نصاب تعلیم کی سہ ماہی میعاد میں تکمیل کرائی جائے گی۔ اس تربیتی جماعت میں داخلہ زیادہ تر طلباء ان اصحاب کے لئے کھلا رکھا جائے۔ کمترین معیار قابلیت میٹریکیولیشن بھی مقرر کیا جاسکتا ہے۔

اس تربیتی جماعت میں اطرافِ ملک کے مسلمانوں کو داخلہ اور تربیت کی مناسب سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ چونکہ ان جماعتوں کے نصاب کی تیاری اور مناسب تعداد میں مسلمانوں کی تربیت میں چار ماہ سے زیادہ کی مدت صرف نہ ہوگی اس لئے ملک میں بنکوں کے قیام اور ان کے آغاز کار کے لئے زیادہ عرصہ تک انتظار کی ضرورت داعی نہ ہوگی۔

مسلمانوں کے ان بنکوں کی رہنمائی اور حل طلب امور میں ان کو مشورہ دینے کے لئے مرکز میں ماہرین معاشیات و بنک کاری پر مشتمل ایک کمیٹی کا قیام عمل میں لایا جائے جو ان بنکوں کو فنی ہدایات اور حسب ضرورت مشورہ دے سکے۔ یہی مرکزی مشاورتی کمیٹی

اس امر کا بھی تعین کرسکے گی کہ ان بنکوں میں سے کونسے بنک تجارتی (COMMERCIAL BANK) ہوں گے اور کن بنکوں کو انڈسٹریل بنکوں کی حیثیت دی جائے گی اور کن بنکوں سے صرف رقمی نہ اد دستند کا کام لیا جائے گا۔

بنکوں کے اس طرح قیام سے جہاں مسلمانوں کو پس اندازی کی ترغیب اور سہولت حاصل ہو گی وہیں کروڑہا روپے کا سرمایہ پیدائش دولت کے کاروبار میں مشغول کرنے کے لئے مجتمع ہوجائے گا اور اس طرح مسلمانوں کی قومی آمدنی میں اضافہ کے علاوہ معاشیات ملک میں ان کا موقف بلند ہوجائے گا۔

تجارت — معاشیات کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ اقوام کی قومی آمدنی میں بیشتر اضافہ کرنے والے پیشوں میں اولیت تجارت کو حاصل ہے۔ یہ تجارت ایک تو اجناس خام کی ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہیں اور جن کو یا تو اندرون ملک استعمال کیا جاتا ہے یا بیرون ملک برآمد کی جاتی ہیں۔ جن میں اجناسِ خوردنی کے علاوہ تیل والے بیج کپاس وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرے ان اشیاء کی تجارت ہے جو اندرون ملک بذریعہ صنعت و حرفت تیار کی جاتی ہیں۔ تیسرے ان اشیاء کی تجارت جو بیرونِ ملک سے درآمد کی جاتی ہیں۔ تجارت کی کامیابی کے دو لوازم ہیں۔ اول سرمایہ دوم طریقہ ہائے تجارت میں مہارت۔

سرمایہ علاوہ انفرادی ذرائع کے ان بنکوں کی وساطت سے بھی فراہم کیا جا سکتا ہے۔ جن کا بموجب فقرہ بالا ملک میں قیام عمل میں آچکا ہوگا۔

طریق و اصول ہائے تجارت میں مہارت ایک جماعت تعلیمی کے ذریعے مہیا کی جانی چاہیئے۔ جس کی میعادِ تربیت ششماہی ہو۔ جہاں عام تجارتی اصول اور طریقوں کی تعلیم کے علاوہ ملک کے اجناس خام کی اقسام۔ مقدار، مراکز، بازار اور اندرون و بیرون ملک ان کی طلب وغیرہ جیسے متعلقہ امور کی معلومات اعداد و شمار کی روشنی میں بہم پہنچائی جائیں۔ نیز ملکی و غیر ملکی مصنوعات کی اقسام مراکز۔ بازار اور اُن کی طلب کے متعلق

مسائل کے علاوہ ان کی ایجنسیاں حاصل کرنے کے طریقے وغیرہ ان کے نصاب تعلیم کا جزو ہوں
اس تربیتی جماعت میں داخلے کے لئے اقل ترین معیار قابلیت میٹریکیولیشن ہونا چاہیئے۔
تجارتی اغراض کے لئے تربیت یافتہ یہ جماعت جب فارغ التحصیل ہو جائے گی۔
تو مسلمانوں کے تجارتی کاروبار میں ان کی خدمات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور اطراف ملک میں
مختلف انواع و اقسام کے تجارتی کاروبار کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔

واضح رہے کہ یہ تجارتی کاروبار انفرادی بھی ہوسکتے ہیں یا ان کو امداد باہمی کی انجمن ہائے
فروخت یا سنڈیکیٹ (SYNDICATES) کے نمونے پر بھی چلایا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں نے اب تک جو یہ اتفاقی اور بے رخی پیشہ تجارت سے برتی ہے اس کا ناگزیر
نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ عام اور معمولی حالات میں اس پیشہ میں اُن کا داخلہ اور میدان مسابقت
میں دیگر ہمسایہ اقوام کا مقابلہ جو صدیوں سے اس پیشہ کی اجارہ دار بنی ہوئی ہیں مسلمانوں کے لئے
نہایت صبر آزما اور ہمت شکن ہوتا لیکن موجودہ جنگ سے پیدا شدہ حالات اس خصوص میں
بالکل مساعد ہیں۔ کیونکہ اجناس خوردنی کی قیمتوں اور درآمد پر تو کلیتہً سرکاری نگرانی اور تحدید
قائم ہے اور دیگر اجناس خام کی قیمتوں اور درآمد و برآمد پر بھی بڑی حد تک سرکاری نگرانی
عائد ہے۔ اس سرکاری نگرانی کا ہمارے حق میں ایک نہایت مفید نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس نگرانی
نے مسابقت کو ختم کر دیا ہے۔ اس لئے یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ دیگر ہمسایہ اقوام اپنی قدامت
اور مسابقتی قوت کے ذریعے نو وارد مسلمانوں کو میدان تجارت سے خارج کر دینے میں بہت
کم کامیاب ہوسکتی ہیں۔ یہی حال ان اشیاء صنعتی کی تجارت کا ہے جو یا تو اندرون ملک تیار
ہوتی ہیں یا سردست قلیل مقدار میں درآمد کی جاتی ہیں۔

میدان تجارت میں داخل ہونے اور اس پر قبضہ کرنے کا قدرت نے ایسا نادر موقع
ہماری قوم کو عطا کیا ہے کہ بغیر خاص نقصانات برداشت کئے قابل قدر تجربات حاصل کر کے
وہ اس شعبۂ زندگی میں اپنے قدم مضبوطی سے جما سکتی ہے۔ اگر اس نادر و بیش بہا موقع کو ہم نے

ان مصنوعات کو امداد باہمی کے اصولوں پر چلایا جانا اور امداد باہمی کے اصولوں ہی پر ان کے لئے اشیائے خام کی فراہمی کا انتظام کیا جانا مناسب ہوگا۔

ان مصنوعات کی کامیابی کے لئے سب سے زیادہ اہم سوال ان کی نکاسی کا ہے اس مقصد کے لئے مجالس اتحاد المسلمین اضلاع کے توسط سے ان مصنوعات کی طلب کے اعداد و شمار فراہم کئے جاسکتے ہیں اور ان تجار کی خدمات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے جو باب دوم کے تحت کاروبار تجارتی میں مصروف ہوں گے۔

گھریلو مصنوعات کی امداد باہمی کی ان انجمنوں کے کارپردازوں کی تربیت کے لئے ایک تربیتی جماعت قائم کی جائے جہاں سہ ماہی تربیت کا انتظام ہو۔ ان کے نصاب میں امداد باہمی کے اصول اشیائے خام کی فراہمی کے طریقے۔ صناعوں سے مصنوعات کی تیاری کے قاعدے عام نظم و نسق اور نگرانی کے اسلوب داخل ہوں گے۔

گھریلو صنعتوں کے قیام اور ان کی ترقی کے لئے عام نگرانی اور رہنمائی کے لئے مرکز میں ایک کمیٹی قائم کی جائے جو ان مصنوعات کو ایک دوسرے سے مربوط اور ان میں توازن برقرار رکھنے کے علاوہ اس امر کا مشورہ دیا کرے کہ کون سی صنعت کس حصۂ ملک میں قائم کی جاسکتی ہے۔

اس خصوص میں تفصیلی تجاویز کے لئے تنظیم مابعد جنگ کی اس کمیٹی کی تجویز سے استفادہ کی سفارش کی جاتی ہے جو حکومت سرکار عالی نے حضرت قائد ملت مد ظلہ العالی کی ممتاز صدارت میں قائم کی ہے۔

ملک میں گھریلو مصنوعات کے قیام۔ احیاء اور استحکام کے لئے دوران جنگ کا یہ زمانہ غیر معمولی طور پر مساعد اور موافق ہے جبکہ غیر ملکی سامان کی درآمد کی تخفیف اور بالخصوص سستے جاپانی مال کی درآمد کی موقوفی کے باعث ہندوستانی بازار میں ہماری ان گھریلو مصنوعات کا کوئی مدمقابل باقی نہیں رہا ہے۔ اگر ان موافق حالات سے

استفادہ کرکے مسلمانوں نے گھریلو مصنوعات کے قیام کی کوشش نہیں کی تو زمانہ مابعد جنگ میں ان کے قیام کے امکانات اُمید افزا نظر نہیں آتے۔

عمارتی کاروبار | ملک میں تعمیر شوارع۔ ذرائع آبپاشی۔ آب رسانی اور عمارت ہائے سرکاری کی بے شمار اسکیمات روبہ عمل لائی جاتی ہیں اور تنظیم مابعد جنگ کے تحت تو اس نوعیت کی اسکیمات کے علاوہ ہائڈرو الکٹرک اور کارخانہ جات کی مزید اسکیمات نافذ ہوں گی اور خود اہل ملک کی غیر سرکاری مساعی سے بھی صنعت و حرفت کی جو توسیع عمل میں آئے گی اور جدید کارخانہ جات تعمیر ہوں گے ان میں عمارتی کاروبار اور انجینیرنگ کے وسیع مواقع فراہم ہوں گے۔

مسلمانوں میں اگرچہ انجینیرنگ کی تعلیم کافی ترقی کرچکی ہے اور انجینیری کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان بھی خاص تعداد میں موجود ہیں لیکن اس قسم کے کارہائے تعمیر و ترمیم کا سارا کاروبار یا تو ہمسایہ اقوام کے ہاتھوں میں ہے یا بیرون ملک سے لوگ آکر اس منفعت بخش کاروبار سے نفع کما رہے ہیں۔ اگر انجینیری کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان بجائے ملازمت سرکاری کی تلاش میں سرگردانی کے تعمیر و ترمیم کے کاروبار چلانے کی جانب متوجہ ہوجائیں اور ملک کے دیگر کاروباری اشخاص کو بھی اس کاروبار کے چلانے کا تجربہ حاصل کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں تو نہایت آسانی کے ساتھ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اس منفعت بخش کاروبار میں مصروف ہوکر قومی آمدنی میں اضافہ کا موجب ہوسکتی ہے۔

یہ کاروبار انفرادی طور پر بھی چلائے جاسکتے ہیں اور محدود کمپنیوں کے قیام کے ذریعے بھی۔ ان انفرادی کاروباری اشخاص اور کمپنیوں کو جو مختلف حصص ملک میں قائم ہوں گی مشورہ دینے اور ان کو اس کاروبار سے متعلق ضروری حالات اور واقعات کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے لئے ایک مرکزی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔

اس کاروبار کی مالی ضروریات کی تکمیل مسلمانوں کے بنکوں (متذکرہ باب) سے

کی جاسکتی ہے۔

واضح رہے کہ کارہائے تعمیر و ترمیم کے ایسے کاروبار سے اب تک مسلمانوں نے غیر معمولی بے اتفاقی برتی ہے۔ اگر مسلمان اس جانب متوجہ ہو جائیں تو بہت آسانی کے ساتھ وہ اس کاروبار میں مستحکم بنیادوں پر قائم ہوسکتے ہیں اور اس طرح اپنی قومی آمدنی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرسکتے ہیں۔

زراعت: زراعت ہمارے موجودہ منصوبہ میں شامل نہیں ہے اور نہ اس پیشہ سے متعلق تفصیلی تجاویز پیش کرنا ہمارا مقصد ہے۔ لیکن بلحاظ اس کے کہ زراعت ہمارے ملک کا ایک بنیادی اور ابتدائی پیشہ ہے۔ اس سے بھی مسلمانوں کو بمقابلہ موجودہ بہتر استفادہ کرنا چاہیے اور سرکار عالی کے محکمہ زراعت کی ترقیات اور خدمات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

غرضکہ مسلمان بنک کاری کے ذریعے اپنی آمدنیوں کو پس انداز کرکے اس کو تجارت اور صنعت و حرفت جیسے منفعت بخش کاروبار میں استعمال کرکے مزید پیدائش دولت کے لائق اور اس طرح قومی آمدنی میں بے انتہا اضافہ کے موجب ہوں گے۔ ایک ایسے زمانے میں جبکہ دنیا میں سیاسیات کی بنیاد معاشیات پر ہو مسلمانان حیدرآباد کو اپنے سیاسی موقف کے استحکام میں امداد کے علاوہ اس طرح جو مزید دولت وہ پیدا کریں گے تنظیم مابعد جنگ کی تعمیر میں دفاعی (DEFENCE HEAVY INDUSTRIES) اور کلیدی صنعتوں (BASIC INDUSTRIES) میں مشغولہ اصل کے ذریعے معاشیات اور سیاسیات ملک میں بہتر مقام حاصل کرسکیں گے۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ اگر وہ موجودہ ترقی حاصل کرلیں تو ملک کی آیندہ سیاسی اور معاشی تنظیم میں انہی کی آواز کو بڑا دخل ہو۔

ماہر کاریگر: مصنوعات خواہ بر پیمانہ کبیر ہوں خواہ گھریلو ان کے قیام و ترقی کے لئے ماہر کاریگر اور ہنرمند (TECHNICIANS) کا وجود لازمی اور لابدی ہے۔ ایک

زمانہ تھا ... ٹیکنیکل تعلیم عنقا تھی اور باوجود سعی بسیار کے اس کا حصول دشوار تھا۔ لیکن آج ملک کے باعث نہ صرف اس نوع کی تعلیم و تربیت کی سہولتیں حاصل ہو گئی ہیں بلکہ منجانب سرکار ترغیبی وظائف ... بھی دئے جا رہے ہیں۔ ایسے زرین موقعے سے استفادہ نہ کرنا بڑی بدنصیبی کی بات ہے۔

مسلمانوں میں ٹیکنیکل تعلیم کے عام کرنے اور مسلمان ماہر کاریگروں کی فراہمی کی خاطر ایک کمیٹی قائم کی جانی چاہئے جو ذیلی مجالس اتحاد المسلمین کے توسط سے ٹیکنیکل تعلیم کے لئے امیدواروں کی فراہمی کے علاوہ اس امر کی ... کرے گی کہ طلبا کی کس قدر تعداد گھریلو صنعتوں کی تربیت حاصل کرے اور کتنے طلبا ایسی ... بیت کے لئے منتخب کئے جائیں جو فارغ التحصیل ہو کر جاری اور دفاعی صنعتوں میں ... ہو سکیں۔ یہ کمیٹی اس امر کی بھی نگرانی کرتی رہے گی کہ طلبا متناسب تعداد میں حسب ضرورت فنی تعلیم کے مختلف شعبہ جات میں داخل ہوں تاکہ آئندہ ان کو برسر روزگار ہونے میں دقتیں نہ اٹھانی پڑیں اور ان صنعتوں میں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تناسب بھی حاصل رہے۔

سائنٹفک تحقیقات | ایسے مسلمان جو جامعات سے سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے نکلتے ہیں اور پھر مختلف غیر سائنٹفک ملازمتیں اختیار کرکے اپنی قابلیتوں کا خون کرتے ہیں۔ قوم کو فائدہ کی بجائے مضرت پہنچانے کے باعث ہوتے ہیں۔ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ایسے صلاحیت رکھنے والے نوجوانوں کے سائنٹفک رجحانات کو ضائع جانے سے بچایا جائے۔ مرکز میں اس غرض کے لئے ایک کمیٹی کا قیام عمل میں لایا جائے جو سائنس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو حکومت کے مختلف محکمہ جات کے تحت قائم کردہ تجربہ خانوں اور ریسرچ گاہوں میں داخلہ کی سہولتیں بہم پہنچائے۔ جہاں یہ نوجوان اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور ایجاد واختراع وانکشافات سے ملک کو فائدہ پہنچائیں۔ کمیٹی نہ صرف حکومت سرکار عالی سے وظائف حاصل کرنے میں ان کی امداد کرے گی بلکہ خانگی عطایا حاصل کرکے وظائف کے

ذریعے ان کی مالی مشکلات رفع کرکے ان کی ہمت افزائی کرے گی۔

صنعتی اور تجارتی کاروبار کے مہتمین و منتظمین | صنعت و حرفت اور تجارت کو کامیابی سے چلانے کے لئے صرف سرمایہ کی فراہمی۔ سائنٹفک ایجادات و اختراعات اور ماہرین فن کاریگروں کا وجود ہی کافی نہیں ہے۔ جب تک کہ اُن کے اہتمام کے لئے بھی ایک طبقہ ایسا موجود نہ ہو جو اپنی گوناگوں صلاحیتوں۔ وسیع تجربہ، اعلیٰ مہارت اور ذاتی قابلیت سے ان صنعتوں کو اپنی نگرانی اور انتظام کے ذریعے ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچا دے۔ اس قسم کے منتظمین و مہتمین کے لئے ہمہ جہتی، علمی، معاشی، مالیاتی اور سائنٹفک صلاحیتوں کے علاوہ اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایسے افراد صنعتی و حرفتی اہتمام کے عملی تجربہ کے بھی حامل ہوں۔

بحالت موجودہ بہترین صورت یہ ہے کہ جتنی صنعتی کمپنیاں اور کارخانہ جات کا ملک میں قیام عمل میں آتا جا رہا ہے۔ مسلمان تعلیم یافتہ مسلمان مالکان اصل مسلمان تاجر اور مسلمان مالکان کارخانہ جات اُن کے منیجنگ ڈائرکٹر یا کم از کم رکن بورڈ آف ڈائرکٹرس مقرر ہونے کی سعی کریں اور ان کمپنیوں کے نظم و نسق سے متعلق معلومات حاصل کریں۔ جتنی زیادہ مستعدی کے ساتھ وہ ان کارخانہ جات کے نظم و نسق کی نگرانی کی کوشش کریں گے اتنا ہی ان کا تجربہ وسیع ہوگا۔

اس طرح وہ آئندہ دیگر صنعتوں کے قیام اور اُن کو کامیابی سے چلانے کے زیادہ سے زیادہ اہل قرار پائیں گے اور آئندہ قائم ہونے والی صنعتی کمپنیوں میں بہ حیثیت منیجنگ ڈائرکٹر انھی کی زیادہ قدر اور طلب ہوگی۔

نشر و اشاعت | ہماری ایسی منصوبہ بندی کی کامیابی کا انحصار پروپیگنڈے کے ذریعے عوام کی غیر معاشی ذہنیت کو معاشی بنانے پر ہے۔ معاشی جد و جہد کی اہمیت اور عظمت کو ان کے قلوب میں جاگزیں کرنے کے لئے دو امور کی ضرورت ہوگی۔

۱۔ ہفتہ وار معاشی اخبارات اور ماہوار معاشی رسائل کا اجرا جو معاشیات

کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کے لئے معاشی مباحث اور نقد و نظر کے کام آئیں اور مختلف کاروبار دل اور پیشوں میں مصروف لوگوں کو وقت کے اہم معاشی مسائل سے روشناس کرانے ان کی مشکلات کے حل دریافت کرنے اور دیگر ممالک کی معاشی ترقی سے بھی آگاہ کرنے کا ذریعہ ہوں۔

۲۔ مرکز میں ایک معقول معاشی کتب خانہ کا قیام اور ملک کے اہم مراکز میں معاشیات کا ضروری لٹریچر فراہم کیا جائے اور اہم موقتی مسائل کی نسبت چھوٹے چھوٹے عام فہم کتابچے شائع کئے جائیں۔ جن سے لوگوں کی معاشی معلومات تازہ اور ان میں اضافہ ہو۔ معاشی کانفرنسوں اور اہلیانِ صنعت کے اجتماعات کے انعقاد سے بھی نشر و اشاعت کے اغراض کی بہ احسن الوجوہ تکمیل ہونے کے علاوہ ملک کی معاشی ترقی کے امکانات آئندہ کے لئے متجاویز پر غور کیا جا سکتا ہے۔

منصوبہ ہذا کے نفاذ کا طریقہ سطور بالا میں ہم نے منصوبہ کے اہم خط و خال کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ضروری اعداد و شمار و واقعات کی عدم دست یابی کے باعث تفصیلی منصوبہ بندی کرنے سے مجبوری رہی۔ اس لئے منصوبہ ہذا کے نفاذ سے قبل اعداد و شمار اور حالات اور واقعات کی فراہمی نہایت ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے منصوبہ ہذا کی اساس پر ایک بند سوالات مرتب کرکے جوابات حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اور حسب ضرورت اس مقصد کے لئے معاشیات کے طیلسان نوجوانوں کی خدمات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے جن کی بفضلہٖ تعالیٰ ملک میں اب کوئی کمی نہیں ہے۔

تفصیلی منصوبہ بندی کے لئے ایک سنٹرل پلاننگ کمیشن کا انعقاد ضروری ہے۔ مندرجہ بالا ہر شعبہ کی کمیٹی اس کی رہنمائی اور زیرِ ہدایت کام کرے گی اور اپنی رپورٹیں اس مرکزی منصوبہ بندی کمیٹی کے پاس روانہ کرے گی۔ جب تفصیلی منصوبہ مدون اور مرتب ہو جائے گا تو اس کے نفاذ کی ذمے داری ہر ضلع کی مجلس اتحاد المسلمین ہو گی۔

چونکہ اس وقت ہمارے پیش نظر مطلوبہ اعداد و شمار نہیں ہیں۔ اور ہم تفصیلی منصوبے

کی ترتیب سے اس سبب سے قاصر ہیں اس لئے اس نوبت پہ اس امر کا تعین ہمارے لئے دشوار ہے کہ اس منصوبے کے بروئے عمل آنے کے بعد مسلمانان حیدرآباد کی قومی آمدنی میں کتنا اضافہ ہوگا۔ لیکن ہم اتنا ضرور وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج کل بے روزگاری کی جو شکایت تعلیم یافتہ نوجوانوں میں عام ہے ہمارے منصوبے کے جامۂ عمل پہن لینے کے بعد نہ صرف یہ کہ رفع ہو جائے گی بلکہ مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے کاروبار کی اتنی گوناگوں راہیں پیدا ہو جائیں گی کہ ملک میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کمی نظر آنے لگے گی۔

منصوبہ ہٰذا کے نفاذ کی میعاد منصوبہ ہٰذا پر مملکتی مجلس عاملہ ماہرین معاشیات کی آراء میں غور فرمائے گی اور اس کے بعد منصوبہ ہٰذا کو مناسب ترمیمات کے ساتھ نافذ کرے گی۔ غور و فکر کی اس منزل کے لئے ہماری رائے میں تین ماہ کی مدت کافی ہے۔ اس کے بعد بنک کاری کی تربیت کے لئے نصاب کی ترتیب کے لئے ایک ماہ کی مدت درکار ہوگی اور بنک کاری کی تربیتی جماعت کے نصاب تعلیم کی میعاد تین ماہ کافی ہوگی۔ اس نوبت پر ملک میں بنک کاری کا آغاز ہو جائے گا۔ چار ماہ کی اس مدت کے دوران میں تجارت اور صنعت و حرفت کے اعداد و شمار کی فراہمی اور تجارت کے لئے تربیتی جماعت کے نصاب کی ترتیب مکمل کر لی جائے گی اور تجارت و صنعت و حرفت کے لئے تربیتی جماعتوں کا افتتاح عمل میں آ جائے گا۔ جن کے نصاب تعلیم کی میعاد ششماہی ہوگی نصاب تعلیم کی اس مدت کے اختتام پر ملک میں تجارت و صنعت و حرفت کے مختلف کاروبار کے اجراء کا امکان پیدا ہو جائے گا گویا منصوبہ ہٰذا کے اہل ملک کے آگے پیش ہونے کی تاریخ سے ۱۳ ماہ کے اندر ملک میں مختلف تجارتی کاروبار اور گھریلو مصنوعات کی تیاری کا آغاز ہو جائے گا نفاذ منصوبہ ہٰذا کے سال دوم میں معمولی کام کا آغاز ہوگا لیکن سال سوم میں اس کی تکمیل ہو جائے گی۔

جیسا کہ ہم اس سے قبل واضح کر آئے ہیں ہمارا یہ منصوبہ زمانہ مابعد جنگ کے لئے نہیں ہے بلکہ بحالات موجودہ اس کا نفاذ مقصود ہے۔ تاکہ جنگ کے بعد آنے والی تخفیفات سے مسلمان بیشتر سے بیشتر استفادہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔

تعلیم میں ہاتھ کا کام

تاریخی نشوونما

(۱)

تعلیم میں ہاتھ کا کام کب سے اور کس شکل میں شروع ہوا، اس کا تعین بہت مشکل ہے، پھر بھی سب سے پہلے یونانیوں کے ہاں اس کا پتہ چلتا ہے۔ ارسطو نے اپنی کتاب "سیاست" میں لکھا ہے کہ یونان میں باورچی، نائی، لوہار، بڑھئی اور معمار ان میں سے ہر ایک پیشہ ور کی تعلیم کا ان کے اپنے اپنے فن میں نہایت معقول انتظام تھا۔

لیکن تعلیم کے ساتھ ہاتھ کا کام اس سے زیادہ مرتب اور منظم شکل میں وسطی یورپ کی خانقاہوں کے اندر سکھایا جاتا تھا جو قرونِ وسطیٰ میں قائم ہوئیں۔ چوتھی صدی عیسوی میں عیسائیوں کے ایک عالم باسل نے جب خانقاہوں کی تعلیم کی تنظیم کی تو اس میں صرف و نحو، عروض، اور انجیل وغیرہ کی تعلیم کے ساتھ ایک نہ ایک ہاتھ کے کام کا بھی انتظام کیا، مثلاً لکڑی کا کام، دھات کا کام، کتائی بنائی، خیاطی، معماری اور زراعت وغیرہ۔ یہ خانقاہیں اس زمانہ میں ان فنون کی تعلیم کا مرکز بن گئیں۔ قلمی کتابوں میں طلائی یا نقرئی کام کی وجہ سے ہونا ری کے کام میں بھی بڑی ترقی ہوئی۔ بعض بعض مشہور پادری اور عیسائی علماء لکڑی، دھات اور ہاتھی دانت کے کاموں میں بڑے ماہر کاریگر ہو صناع ہوتے تھے۔ بعض پادریوں نے اپنے ماتحت پادریوں پر یہ لازم کر دیا تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی ہاتھ کا کام ضرور سیکھیں تاکہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں جا کر اپنے پیروؤں کو کوئی ہاتھ کا کام بھی سکھا سکیں۔

ساتویں صدی عیسوی میں سینٹ بینڈکٹ نے خانقاہوں کی از سرِ نو تنظیم کی اور اس میں انھوں نے ہر راہب کے لئے سات گھنٹے روزانہ ہاتھ کے کام کا اصول رکھا۔ اس اصول کی وجہ سے خانقاہوں کے اندر بہت سی برائیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کا خیال تھا کہ تنہائی کی زندگی میں ذہن یا دماغ اکثر آزمائشوں کا شکار ہو جاتا ہے، اس لئے انھیں زیادہ سے زیادہ وقت ایسے کاموں میں مصروف رہنا چاہیے جن میں محنت و مشقت کی ضرورت ہے۔ راہبوں کے مختلف ہاتھوں کے کام اختیار کرنے کی وجہ سے ایک تو وہ پیشہ وروں کے قریب آ گئے

اور دوسرے ان پیشہ وروں کے سامنے زندگی کا ایک بہتر نمونہ آگیا، اور تیسرے یہ کہ بعض بعض ہاتھ کے کاموں مثلاً زراعت، لکڑی، چمڑے اور دھات کے کام، اون اور کپاس کے کام، راج اور معماری کے کاموں میں بڑی ترقی ہوئی۔

لیکن تعلیم میں ہاتھ کے کام کا شمول سب سے زیادہ باقاعدہ شکل میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی تین شکلیں تھیں:

(۱) ایک ایسی مثالی زندگی میں زراعت، نجاری اور دوسرے ہاتھ کے کاموں کا ذکر جو دوسروں کے لیے بطور نمونہ پیش کی گئی ہو۔

(۲) ایسے معلمان تعلیم کے افکار و خیالات میں جنھوں نے عام تعلیم کے ساتھ ہاتھ کے کام کی تلقین کی ہو، اور

(۳) ان معلمان تعلیم کے اثر سے عملاً اداروں اور مدرسوں میں ہاتھ کے کام کا شمول۔

نشاۃ ثانیہ کے دور میں بعض ایسی مثالی زندگی کے نقشے پیش کیے گئے جن میں ہاتھ کا کام ایک اصلاح یافتہ زندگی کا جزو قرار دیا گیا۔ زندگی کے ان مثالی نقشوں میں بعض میں یہ معاشی وجوہ کی بنا پر شامل کیا گیا تھا، بعض میں اس لیے کہ یہ ایک حقیقی زندگی کا جزو سمجھا گیا اور بعض میں اس وجہ سے کہ اس وقت کے تنگ اور محدود نصاب کے خلاف یہ ایک احتجاج تھا۔

اس قسم کی مثالی تصویروں میں سر طامس مور کی کتاب "مثالی دنیا" (یوٹوپیا) سب سے زیادہ مشہور ہے جو ۱۵۱۶ء میں شائع ہوئی۔ اس مثالی زندگی میں انھوں نے سب سے پہلی بار مدرسہ کی عام تعلیم کے ساتھ ہاتھ کے کام کو بھی شامل کیا ہے۔ ان کے اس مجوزہ نظام زندگی میں ہر شہری کو ایک نہ ایک ہاتھ کا کام اور زراعت جاننا ضروری ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "تمام شہریوں کو اس کی بچپن سے تعلیم دی جاتی ہے جس کا کچھ حصہ تو وہ مدرسے میں سیکھتے ہیں اور کچھ عملی طور پر حاصل کرتے ہیں۔ انھیں اکثر شہر سے باہر کھیتوں میں لے جایا جاتا ہے جہاں وہ نہ صرف دوسروں کو کام کرتے دیکھتے ہیں بلکہ وہ خود بھی انھی کی طرح کرتے ہیں۔"

اس کے بعد نشاۃ ثانیہ کے مصلحین میں راَبیلے کا درجہ آتا ہے جس نے تعلیم میں ہاتھ کے کام کو اس سے بھی زیادہ اہمیت دی ہے۔ راَبیلے نے اپنی تعلیمی اسکیم میں یہ ذکر کیا ہے کہ بچوں کو اپنے گرد و پیش کے حالات سے آشنا کرنے کی غرض سے انھیں یہ چیزیں دکھانے کے لئے لے جایا جاتا ہے کہ

"کس طرح دھات کا کام کرنے والے، لکڑی کا کام کرنے والے اپنا کام کرتے ہیں اور سونا اور ہیرے جواہرات کاٹنے والے اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کو کیمیا گروں سکہ بنانے والوں، کپڑا بننے والوں، مخمل کا کام کرنے والوں، گھڑی سازوں، آئینہ سازوں چھاپہ گروں اور اسی قسم کے دوسرے کاریگروں کے کام دکھلانے کے لئے لے جایا جاتا ہے"

راَبیلے کا بچوں کو ان ہاتھ کے کاموں سے آشنا کرانے کا ایک اور مقصد بھی تھا اور وہ یہ کہ بچوں کو سماجی زندگی کے ان پہلوؤں کا کچھ تجربہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ ان کی جسمانی ورزشوں کے سلسلے میں بھی بعض اسی قسم کے محنت طلب کاموں کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً بارش کے زمانے میں وہ سوکھی گھاس کا ذخیرہ جمع کرتے، لکڑیاں چیر پھاڑ کر اکٹھا کرتے اور بالوں سے مکا کے دانے نکال کر کھتوں میں جمع کرتے ہیں۔

اس زمانے میں حقیقت پسندی کی تحریک زوروں پر تھی اور اس کا سب سے بڑا علمبردار انگلستان کا فلسفی بیکن تھا۔ بیکن چونکہ ایک فلسفی تھا، اس لئے اس نے سب سے زیادہ اس امر سے بحث کی ہے کہ علم کیا ہے؟ اور اس کی بنیاد اس نے محتاط مشاہدے پر رکھی ہے۔ تعلیمی اصلاح کے سلسلے میں اس نے پرانے طرز کی ادبیاتی تعلیم کو چھوڑ کر ایک ایسی تعلیم کا تصور پیش کیا ہے جو حقیقت پسندی پر مبنی ہو اور اس ... یہ وہی تعلیم ہو سکتی تھی جو ہاتھ کے کام سے متعلق ہو۔ چنانچہ اس نے اپنے مثالی مدرسے "بیت السلیمان" میں جس طرز کی تعلیم کا ذکر کیا ہے وہ یہی حرفہ یا دستکاری کی تعلیم ہے۔ اس مدرسے کے علاوہ اس نے تین "استادانِ فن" رکھے ہیں جو تمام میکانیکی فنون، سائنس کے تجربوں اور ایسے کاموں کے نمونے جمع کرتے ہیں جن کا آرٹ میں شمار نہیں ہے۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی کیمپانیل ہے جس کی ایک مشہور کتاب "بلدۃ الشمس" کتاب میکانیکی کے نام سے ۱۶۲۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اس نے ایک ایسے شہر کا نقشہ کھینچا ہے جس میں سات اہم مرکز

دائرے ہیں اور ہر دائرے کی دیواریں عام تعلیم کی غرض سے استعمال کی جاتی ہیں۔ اس تعلیم کا تمام نصاب حقیقت پسندی پر مبنی ہے اور بچوں کو تعلیم الفاظ کے ذریعے نہیں بلکہ اشیاء کے ذریعے دی جاتی ہے۔ ہر دیوار پر تصویریں، نقشے اور نمونے بنے ہوئے ہیں جو کسی نہ کسی فن سے تعلق رکھتے ہیں۔ چھٹے دائرے کی دیوار خاص طور سے دستکاریوں اور صنعتوں سے متعلق ہے۔ اس دیوار پر ہر قسم کے میکانکی فنون کو جگہ دی گئی ہے اور ان سے متعلق تمام ضروری آلات و اوزار بنائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ [illegible] کی تعلیم کی اہمیت سب سے زیادہ اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے سکھانے کے لئے سب سے بڑے [illegible] کو مقرر کیا جاتا ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ کارخانوں میں جاکر کام کا دیکھنا بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ریاست میں ہاتھ کے تمام کاموں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور جو شخص ہاتھ کا کام بہت اچھا کرنا جانتا ہے اس کی انتہائی عزت و تکریم ہوتی ہے۔

اس سلسلے کی سب سے آخری کڑی آندرے کی کتاب "بلدۃ المسیح" ہے جس میں اس نے نظری اور عملی دونوں قسم کی تعلیم کا خاکہ کھینچا ہے۔ تعلیم کی نوعیت کے ضمن میں وہ لکھتا ہے کہ "اس میں لڑکے اور لڑکیوں دونوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے، لڑکوں کے مطالعہ کا وقت صبح کو ہے اور لڑکیوں کا سہ پہر میں۔ ان کی تعلیم کے لئے استاد اور استانیاں مقرر ہیں۔ لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کا بقیہ وقت ہاتھ کے مشاغل اور امور خانہ داری کے کاموں میں صرف ہوتا ہے تاکہ ہر شخص اپنے طبعی میلان کے مطابق آئندہ اپنا پیشہ اختیار کر سکے۔" عورتوں کی تعلیم سے بحث کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ "شادی شدہ عورتیں اپنے اس علم کا استعمال جو انھوں نے کالج کی تعلیم کے زمانہ میں حاصل کیا [illegible] مدت میں کریں۔ انسان نے ریشم، اون اور سن کی صنعت کے سلسلے میں جو کمال حاصل کیا ہے، وہ کام حقیقت میں عورتوں کا ہے اور ان سے متعلق تمام کام حقیقت میں ان کے لئے ہونا چاہئے۔"

اسی طرح آندرے اپنی دوسری کتاب میں جو ۲۰ سال بعد شائع ہوئی، یہ تجویز کرتا ہے کہ "ہر مدرسہ کو کوشش کرنی چاہئے کہ وہ ہاتھ کے کاموں کے ذریعے بچوں میں میکانیکی مہارت پیدا کرے۔"

دوسرا دور تعلیم میں ہاتھ کے کام کا خیالی اور نظری نہیں بلکہ اس میں ہاتھ کے کام کی عملی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ یہاں ہاتھ کے کام کو ایک مثالی دنیا کے نظری مسئلہ کی حیثیت سے نہیں پیش کیا گیا ہے بلکہ نفسیاتی اور معاشی بنیاد پر اسے [illegible] مدرسوں اور تعلیم گاہوں میں داخل کئے جانے پر زور دیا گیا ہے۔

اس ضمن میں جان ایموس کومی نیس کا نام سب سے پہلے آتا ہی جو سترھویں صدی عیسوی میں ایک بہت بڑا مصلح تعلیم گزرا ہی۔ اس کے تعلیمی خیالات اور نظریے اپنے زمانے سے اس قدر آگے تھے کہ تقریباً دو صدی سے پیشتر انھیں بہ شکل عملی جامہ پہنایا جا سکا۔ اس نے اپنی مشہور کتاب "معلم کبریٰ" میں تعلیم میں ہاتھ کے کام سے بہت مفصل بحث کی ہی۔ اس نے تعلیم کی کئی منزلیں قرار دی ہیں۔ اور ان میں سب سے پہلی منزل کو وہ "آغوشِ مادر" کہتا ہی جو آج کل کے کنڈرگارٹن یا بالک گھر سے بہت مشابہ ہی۔ اس میں وہ لکھتا ہی کہ

"اس عمر کے بچوں کو جہاں تک ہو سکے میکانیکی تعلیم دی جائے اور انھیں اپنے ہاتھ کے استعمال کا برابر موقع ملتا رہے۔ مثلاً چیزوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر رکھنا، انھیں ترتیب دینا، بنانا بگاڑنا، گرہیں لگانا اور کھولنا وغیرہ یہ ایسی باتیں ہیں جنھیں بچے اس عمر میں شوق سے کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ کام چونکہ حقیقت میں ذہن اور دماغ کی قوتوں کے اظہار کا ذریعہ ہیں، اس لئے ان سے انھیں روکنا نہیں چاہیئے بلکہ ان کے کرنے کے اور مواقع بہم پہنچانے چاہئیں، اور ان کاموں میں ان کی صحیح رہبری کرنی چاہیئے۔"

اسی طرح وہ بچوں کے لئے کھیل کود کی سفارش کرنے میں بھی یہی بات پیش نظر رکھتا ہی کہ اس میں انھیں ہاتھ کے کام کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیش آئیں۔ مثلاً وہ کہتا ہی کہ

"بچوں کو کھیل کود کے لئے ایسے کھلونے دئے جائیں، اور انھیں موقع دیا جائے کہ وہ ان سے ایسے کاموں کی نقل اتاریں جو مختلف ہاتھ کے کاموں اور پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً ہل چلائیں اور کھیتی باڑی سے متعلق دوسرے کاموں کی نقلیں اتاریں، راج اور معماری کے کاموں کے چربے کھینچیں، سپاہی بنیں وغیرہ وغیرہ۔"

اس سے آگے کی منزل یعنی ابتدائی تعلیم کے لئے وہ تجویز کرتا ہی کہ

"اس عمر کے بچوں کو چاہیئے کہ وہ میکانیکی حرفوں کے تمام ضروری اصول اور قواعد سیکھیں تاکہ وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا سے بے خبر نہ رہیں اور اگر ان میں اس قسم کے کاموں کا کوئی میلان طبع ہو تو اس کے اظہار کا انھیں آسانی کے ساتھ موقع مل سکے۔"

"اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر انھیں اپنی آئندہ زندگی میں اس قسم کے کاموں کے کرنے کا موقع پیش آئے تو وہ کام انھیں نئے یا دشوار نہ معلوم ہوں بلکہ انھی جیسے نظر آئیں جو وہ پہلے کر چکے ہوں"

کومی نیس ایک اور مدرسہ کا خاکہ کھینچتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ

"اشیاء کے علم کا ہاتھ کے کام سے برابر تعلق اور ربط رہنا چاہیئے بغیر اس کے جس شخص کو علم صحیح حاصل بھی ہو وہ عملی حیثیت سے بے کار ہے۔ اس مدرسے سے کوئی لڑکا اس وقت تک فارغ التحصیل نہیں ہو سکتا ہے جو ان ہاتھ کے کاموں میں اچھی طرح ماہر نہ ہو جنھیں بڑی احتیاط اور ہنرمندی سے کرنے کی ضرورت ہے"

کومی نیس کے تعلیم میں ہاتھ کے کام پر اس قدر زور دینے کے مختلف وجوہ تھے۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ کومی نیس اس گروہ میں داخل تھا جو حقیقت پسند کہلاتا ہے اور اس بنا پر تعلیم میں ہاتھ کے کام پر زور دینے کی وجہ کومی نیس کے نزدیک یہ تھی کہ بچے اپنے گرد و پیش کی دنیا سے بے خبر نہ رہیں۔

دوسری وجہ نفسیاتی تھی۔ اگرچہ اس وقت تک تعلیم میں نفسیات کا کچھ بہت عمل دخل نہ تھا، پھر بھی کومی نیس نے حقیقت پسندی کی بنا پر یہ محسوس کر لیا تھا کہ بچے اس عمر میں کچھ نہ کچھ ہاتھ سے کرنا چاہتے ہیں اور ان کا ذہن یا دماغ محسوس اشیاء کا طالب ہوتا ہے اس لئے ہاتھ کا کام ان کی ان نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

ان فلسفیانہ اور نفسیاتی وجوہ کے علاوہ بعض معاشی اور سیاسی اسباب بھی تھے جو تعلیم میں دستکاری یا حرفہ کے شامل کئے جانے کا موجب کہے جا سکتے ہیں۔ اس زمانے میں تیس سالہ جنگ کی وجہ سے وسط یورپ میں ایک عام افلاس اور بے روزگاری کی لہر دوڑ گئی تھی، اس بنا پر بعض مفکرین اور مصلحین تعلیم اس غربت کا علاج اس طرح کرنا چاہتے تھے کہ جن بچوں میں کسی دستکاری یا حرفہ کے کام کے میلانات ہوں، انھیں تعلیم میں اس کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ان میلانات کو بروئے کار لاسکیں اور آئندہ ان کو کسب معاش کا ذریعہ بنائیں۔

پھر ان کے علاوہ بعض اور وجوہ بھی تھے، مثلاً ہاتھ کے کام سے صحت اور تندرستی پر اچھا اثر پڑتا ہے

اس لئے اسے عام تعلیم کا ایک جزو بنایا جائے۔ نیز اس زمانے کے نظری اور مذہبی مباحثوں سے لوگ تھک گئے تھے، اس لئے تعلیم میں ہاتھ کا کام ایک عام پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

تعلیم میں ہاتھ کے کام کی یہ اہمیت نہ صرف مصلحین تعلیم ہی نے تسلیم کی بلکہ اس زمانے کے بعض فلاسفر اور عقلیین نے بھی اس پر زور دیا ہے۔ ڈیکارٹ سترھویں صدی عیسوی میں فرانس کا ایک مشہور فلسفی گزرا ہے اس کے متعلق اس کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ

"وہ پہلا شخص تھا جس نے دستکاروں کے لئے دستکاری کی عام تعلیم دئے جانے کا خیال پیش کیا۔ اس کا خیال تھا کہ مختلف حرفوں اور دستکاریوں کے لئے بڑے بڑے ہال بنائے جائیں ان میں سے ہر ایک ہال میں ایک چھوٹا سا عجائب خانہ اور ایک مشورہ کا کمرہ ہو۔ عجائب خانے میں اس حرفے سے متعلق ضروری اوزار اور سامان رکھے جائیں۔ اس قسم کے تمام مدرسوں میں ہر حرفے کا ایک نہایت لائق ماہر فن رکھا جائے جو کاریگروں کے تمام سوالات کا تشفی بخش جواب دے سکے اور انھیں تمام باتوں کی وجہ بتا سکے جو روزمرہ کے تمام کاموں میں پیش آتی ہیں۔"

لیکن تعلیم میں ہاتھ کے کام کو اہمیت اس سے زیادہ اس کے ایک جرمن شاگرد وائیگل نے دی، اور اس نے کم و بیش انھی خیالات کا اظہار کیا ہے جو بعد میں فروبل اور ڈیوئی سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بچوں سے ہاتھ کا کام لینا چاہیئے تاکہ وہ خود کام سے عقل و حکمت کی تمام باتیں سیکھیں اس کام کی نوعیت اور اس سے زیادہ خدائے تعالیٰ کی کارسازی سے واقف ہو جائیں اور اس طرح وہ دوسروں سے محض سن کر علم نہ سیکھیں بلکہ ہاتھ کے کام کے ذریعے حاصل کریں۔

اس سے بھی زیادہ اہمیت ہاتھ کے کام کی اس کے شاگرد اور مشہور فلسفی لائب نتز نے دی ہے۔ اور جو کچھ ڈیکارٹ نے کاریگروں اور صناعوں کے بچوں کے لئے کیا تھا وہ یہ سب بچوں کے لئے چاہتا ہے وہ اپنی مشہور کتاب "ایک شہزادے کی تعلیم" میں ایسے بچوں کے لئے جو ذہنی اعتبار سے کسی قدر سست اور غبی ہوں ہاتھ کے کام کی تعلیم کا مشورہ دیتا ہے تاکہ وہ استاد کی مار پیٹ سے اپنی زندگی کے عزیز

سال ضائع نہ کریں اور اس طرح ریاست کا بھی نقصان ہو جو ان کی عدم افادیت سے اتنا ہی گھاٹا اٹھائے گی جتنا وہ خود اپنی عمر کا ایک حصہ کھو کر اٹھایا کریں گے۔ اس لئے کہ ان لڑکوں کی قوت عمل کو اور طرح سود مند کار لایا جا سکتا ہے جن کا ان سالوں میں ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

ڈاکٹر سنتر نے اپنی ایک کتاب میں اس امر کی نہایت پرزور سفارش کی ہے کہ عام تعلیم کے سلسلے میں ۱۲ سے ۱۸ سال کے لڑکوں کو کسی ہاتھ کے کام کی تعلیم دینی چاہیئے۔

ہاتھ کے کام کی تعلیم کے جہاں اور بہت سے مقاصد تھے، وہاں ایک اور خاص غرض بھی تھی۔ سترھویں صدی میں بعض لوگوں نے امراء کے طبقے سے ہر قسم کی اصلاح اور ترقی کی امید قائم کی۔ چنانچہ ان کے لئے حرفہ اور دستکاری کی تعلیم بھی ضروری سمجھی گئی اور اس غرض کے لئے بہت سی تعلیمی اسکیمیں اور مدارس تجویز کئے گئے۔ ان کے لئے ہاتھ کے کام کی تعلیم علاوہ ہاتھ کے کام والوں کی حالت سے واقفیت کے ان کی عام صحت و تندرستی اور تفریح کا ایک بہت بڑا ذریعہ بھی سمجھا جاتا تھا۔

جان لاک نے جو انگلستان کا ایک مشہور فلسفی گزرا ہے اسی بنیاد پر اپنی کتاب "تعلیم سے متعلق خیالات" میں شرفا کے لڑکوں کی تعلیم کی ایک اسکیم پیش کی ہے اور اس سلسلے میں باغبانی، لکڑی کا کام اور دوسرے صنعتی مشاغل تجویز کئے ہیں جن کے فوائد وہ ان لفظوں میں بیان کرتا ہے:۔

"اس سے دو قسم کے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ ایک خود اس کام کی مہارت جو بذاتہ نفع بخش ہے اور دوسرے ورزش جو بغیر کسی اور فائدے کے بہ نظر عام صحت کے لئے مفید اور ضروری ہے۔ دیہات کے شرفا کے لئے میں ان دو چیزوں میں سے ایک یا دونوں تجویز کروں گا۔

(۱) باغبانی یا زراعت کا کام، (۲) نجاری یا لکڑی کا کام۔ ان میں سے ایک میں مہارت حاصل کرنے سے وہ خود اپنے مالی کو قابو میں رکھ سکے گا اور اس کے کام کو بہتر بنا سکے گا۔ دوسرا کام کو سیکھ کر وہ بہت سی استعمال کی چیزیں اور ان کے نمونے بنا سکے گا۔ اگرچہ یہ باتیں میں اس خیال سے نہیں کہہ رہا ہوں کہ یہی اس کام کی اصل غرض و غایت ہیں، بلکہ اس سے محض ان میں ایک میلان پیدا کرنا مقصود ہے۔ میرا اصل منشا تو یہ ہے کہ ایسے کار آمد اور صحت بخش

ہاتھ کے کاموں سے دماغ اور ذہن سنجیدہ باتوں کے سوچنے اور کرنے میں نہ تھکے "

اب تک تو صرف امرا ہی کے طبقے میں ہاتھ کے کام کی تحریک جاری تھی، سترھویں صدی کے بعد سے متوسط اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کے لئے بھی اس خیال کا اظہار ہونے لگا۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں بیلرس نے "ہاتھ کے کام کے لئے ریاضی کے ایک مدرسے کا خاکہ" پیش کیا ہے جس میں وہ لکھتا ہے:-

"جس طرح اعلیٰ اور ابتدائی تعلیم کے لئے امراء کے مدارس قائم ہیں تاکہ ان کے بچّے ان میں تعلیم پاکر مذہبی، سول اور فوجی خدمات انجام دیں، اسی طرح مناسب یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جو آگے چل کر کوئی پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہیں اور جنھوں نے اب تک صرف لکھنے پڑھنے کی تعلیم حاصل کی ہے کسی ایسے میکانکی کام کے مدرسوں میں اس قسم کی تعلیم حاصل کریں جو ان کے مقصد اور ان کی آئندہ زندگی کے مطابق ہو تاکہ انھیں مختلف چیزوں اور آلات و اوزار سے واقفیت حاصل ہو اور وہ اس علم اور واقفیت کو اپنے آئندہ کے کام کو بہتر طور پر اور سوچ سمجھ کر کرنے میں صرف کریں۔"

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جہاں آزادی، جمہوریت اور مساوات کی بنیاد پر نظم زندگی کی ایک نئی داغ بیل ڈالی گئی تھی، عوام کے لئے ہاتھ کے کام کی تحریک اور زور دل پر بڑھی۔ ۱۹۳۵ء میں طامس جیڈ نامی ایک شخص نے لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کا ایک خاکہ تیار کیا، جس میں اس نے لڑکوں کی تعلیم کے لئے یہ شرط رکھی کہ وہ عام تعلیم کے ساتھ کوئی نہ کوئی ہاتھ کا کام بھی سیکھیں، مثلاً ریاضی کے اوزار بنانا، گھڑی سازی، بننے کا کام، جوتہ بنانا، اور ایسے کام جن کا مدرسہ انتظام کر سکے۔" اور لڑکیاں "سن اور اون کی کتائی کا کام، موزے اور دستانے بنانا، سینا پرونا، گھاس پھوس کی ٹوپیاں اور ٹوکریاں بنانا اور ایسے کام جن کا مدرسہ میں انتظام ہو سکے۔"

طامس جیڈ نے اسی پر ختم نہیں کیا بلکہ روزانہ کے پروگرام میں اس نے ہاتھ کے کام کی جگہ بھی معین کی۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ

"بچے صبح کے دو گھنٹے پڑھنے، لکھنے اور حسابات وغیرہ میں صرف کریں۔ اس کے بعد

دو گھنٹے ہاتھ کے ایسے کام میں جو وہ سب سے زیادہ خوشی کے ساتھ کرنے کو تیار ہوں اس کے بعد دو گھنٹے کھانے پینے اور تفریح میں گزاریں پھر دو گھنٹے سہ پہر کے وقت اپنے مختلف کاموں میں صرف کریں۔"
اس کے علاوہ فرینکلن نامی ایک شخص نے ایک انگریزی مدرسے کا خاکہ تیار کیا تھا جس میں اس نے ایک اور نئی چیز پیش کی اور وہ یہ کہ اس نے ہاتھ کے کام کو مدرسے کے کسی نہ کسی مضمون سے مربوط کرکے سکھانے کا مشورہ دیا مثلاً وہ مجسٹی نیچر ذیل میں کہتا ہے کہ

"جس وقت بچے مطالعہ فطرت کا مضمون پڑھ رہے ہوں اس وقت کیا تھوڑا سا باغبانی کا کام مثلاً قلم لگانا، پودا لگانا چشمے باندھنا وغیرہ سکھایا اور کرایا نہیں جا سکتا ہے؟ اور کبھی کبھار انھیں آس پاس کے اچھے اچھے کاشتکاروں کے کھیتوں پر لے جاکر انھیں اچھے طریقۂ کاشت کا مطالعہ نہیں کرایا جا سکتا ہے، اور انھیں یہ ذہن نشین نہیں کرایا جا سکتا ہے کہ زراعت کی ترقی میں سب کا فائدہ ہے اور اس کا سیکھنا کسی کے لئے نقصان کا باعث نہیں؟ اسی طرح تاریخ تعلیم کے سلسلے میں بہت سے میکانیکی کام کرائے جا سکتے ہیں، مثلاً تجارت کی ابتدا، فنون کی ایجاد، صنعتوں کی ترقی، کاروبار کا پھیلنا مع تمام وجوہ اور اسباب کے لڑکوں کے لئے دلچسپی اور فائدہ کا باعث ہو سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ انجن اور مشین کی قوت اور ان کا استعمال قدرتاً بچوں میں یہ خواہش پیدا کرے گا کہ وہ میکانیکی کام کرنا سیکھیں اور اس کے اصولوں سے واقفیت حاصل کریں جن کی مدد سے کمزور انسان نے بڑے بڑے حیرت انگیز کارنامے انجام دئے ہیں اور اس سے ان کی اتنی ساری محنت بچی ہے اور صنعت و حرفت میں اس قدر ترقی ہوئی ہے۔"

جان کومی نیس کے کچھ ہم مذہب جو عیسائیوں کے موراوی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، امریکہ کی ایک ریاست پنسلوے نیا میں آکر آباد ہو گئے تھے اور انھوں نے یہاں آکر تعلیم میں ہاتھ کے کام کے مسئلہ کو اپنے مدرسوں میں اس آسانی سے حل کر لیا تھا جو بہت عرصے تک بعد کے ماہرین تعلیم کے لئے ایک عقدۂ لاینحل بنا رہا۔ انھوں نے اپنے مدرسے میں بچوں کے کھیل کود اور تفریحات کو ایسے کاموں کے تحت رکھا تھا جو وہ آئندہ زندگی میں کرنے والے ہوں، مثلاً زراعت میکانیکی کام وغیرہ۔ انھوں نے اپنے مدرسوں میں اپنے عملی کاموں کے ذریعے یہ ثابت کر دیا تھا کہ یہ خیال محض کھیل نہیں بلکہ اپنے اندر بڑی حقیقت بھی رکھتا ہے۔

حالات حاضرہ

(الف) ممالک غیر

یورپ اور ایشیا کی جنگ اب اس دور سے گذر چکی ہی جب اس کے انجام کے بارے میں شبہ ہو سکتا تھا، اور اب اتحادیوں کی طاقت اتنی ہو گئی ہی کہ وہ اپنا ہر منصوبہ پورا کر سکتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہی کہ جرمن اور جاپانی اپنی شکست تسلیم کرنے پر تیار ہیں. جرمنی کی فوجیں پس پا ہوتے ہوتے ملک کی سرحد تک پہنچ گئی ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ مغرب میں انگریز اور امریکی اور مشرق میں روسی جتنے شدید اور مسلسل حملے کرتے رہے اتنی ہی جلدی جرمن فوجوں کا آخری محاذ ٹوٹ جائے گا۔ آخر جولائی میں ہٹلر کو قتل کرنے کی سازش کامیاب ہوئی ہوتی تو جرمنی کب کا ہتھیار ڈال چکا ہوتا، مگر ہٹلر سلامت ہیں اور نازی پارٹی نے پورا تسلط حاصل کر لیا ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہی کہ جرمن فوجیں قدم جما کر لڑ رہی ہیں اور ڈاکٹر گوئبلز اعلان کر دیا ہے کہ اگر اتحادی اور روسی جرمنی میں گھس آئے تو جرمن قزاقانہ طریقہ پر لڑیں گے۔ یہ محض دھونس نہیں ہے۔ مسٹر چرچل نے اپنی ۲۹ ستمبر کی تقریر میں اس امکان کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جرمن اجتماعی طور پر کبھی جنگ بندی نہ کریں، اور اتحادی لڑائی کو اس وقت ختم سمجھیں جب انھیں یقین ہو جائے کہ جرمن بڑے پیمانے پر جنگ کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ مسٹر چرچل کے نزدیک ایسی صورت سال کے آخر تک پیدا ہو سکتی، مگر یہ بھی ممکن ہی کہ اگلے سال کے چند مہینے اور جرمنی سے لڑنے میں صرف ہوں۔ مشرقی محاذ پر وہی سب کچھ ہو سکتا ہی جو کہ مغرب میں، لیکن یا تو روسی اس بارے میں قیاس آرائی نہیں کرتے کہ جنگ کا فیصلہ کب تک ہو جائے گا، یا ان کے خیال کی اتنی اشاعت نہیں کی جاتی کہ ہمیں بھی کچھ معلوم ہو سکے۔ بہر حال لڑنے میں وہ اتحادیوں سے کچھ کم مستعد نہیں ہیں۔ اور جرمنی کا مغربی محاذ ٹوٹا تو مشرقی محاذ بھی قائم نہ رہ سکیگا۔

اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ جرمن صرف اس وقت تک لڑتے ہیں جب تک کامیابی کی کوئی امید ہو اور جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ جیتنے کا کوئی امکان نہیں ہی تو لڑائی بند کر دیتے ہیں مگر اس جنگ میں یہ دیکھا

گیا ہے کہ انھیں خواہ مخواہ قربانیاں کرنے میں مزا آتا ہے، سٹالن گراڈ اور تونس میں انھوں نے اپنے سپاہیوں کو بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور فرانس میں بھی، جب بظاہر انھیں آدمیوں کی بہت ضرورت تھی انھوں نے بندرگاہوں میں آخر وقت تک مقابلہ کرنے کے لئے سپاہی چھوڑے۔ انھیں قربان کرنے میں کوئی فائدہ نہیں تھا سوا اس کے کہ اتحادی ان بندرگاہوں کو تھوڑے دن اور استعمال نہ کرسکیں گے۔ مسٹر چرچل کے خیال میں یہ محض حماقت کی بات تھی اور وہ "جمع دار" ہٹلر کو ایسی تمام حماقتوں کا ذمہ دار مانتے ہیں۔ لیکن اب جرمنی کے جنرل سٹاف اور سیاسی لیڈروں کو فوج کی پسپائی اور شکست کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا، اور غالباً ان کا منشا یہ ہو کہ ایسی مہموں میں جن کا انجام معلوم ہو کہ کیا ہوگا آدمی ضائع کرکے قوم میں سرفروشی کا ایسا جذبہ پیدا کریں کہ اسے فتح اور شکست سے مطلب ہی نہ رہے، اور وہ اپنے نقصان کو بھی روحانی تکمیل کا ذریعہ سمجھے۔ اتحادی فوجیں جرمنی میں داخل ہو جائیں گی تو معلوم ہو جائے گا کہ نازی پارٹی ایثار اور قربانی کا کیسا جذبہ پیدا کرسکی۔ فی الحال جرمن سپاہیوں اور سپہ سالاروں کے طرز عمل میں اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی کہ وہ ہمت ہار گئے۔ لیکن انھیں یہ امید نہ ہوگی کہ اتحادی ان کے خلوص اور ایثار سے متاثر ہوکر اپنی پیش قدمی بند کردیں گے۔ دراصل نازی لیڈر اور فوج کے سپہ سالار جانتے ہیں کہ بیس پچیس ہزار ہوائی جہازوں کے بیڑے کا صحیح جواب تین بتیس ہزار ہوائی جہاز بھی نہیں ہیں بلکہ جنگ کے ایسے آلات جو ابھی تک اتحادیوں کے پاس نہیں ہیں اور جن کا ردعمل سوچنے میں اتحادیوں کو چار چھ مہینے لگ جائیں گے۔ اُڑن بم ان آلات میں سے پہلا تھا اس کی نئی شکل یہ ہو کہ یہ ہوائی جہاز کے نیچے لگا دیا جاتا ہے اور ہوائی جہاز مناسب فاصلے سے اس کو گولے کی طرح داغ دیتا ہے۔ حال ہی میں خبر آئی ہے کہ ایک چودہ ٹن کا گولہ تیار کیا گیا ہے جس کے پھٹنے کا اثر دو میل تک ہوتا ہے۔ اسی طرح کی دو چار اور ایجادیں ہوں گی۔ لیکن اب سوال یہ ہو کہ جرمن نئے آلات کافی مقدار میں تیار کرکے محاذ تک پہنچا بھی سکیں گے یا نہیں۔ اگر اتحادیوں نے مہینے ڈیڑھ مہینے کے اندر محاذ کو توڑ دیا تو نئے آلات جرمنوں کے کچھ کام نہ آئیں گے، اتحادیوں کو اس سے زیادہ دیر لگی تو ممکن ہو یورپی جنگ کا خاتمہ سال چھ مہینے کے لئے ملتوی ہو جائے۔ لیکن جنگ کا محاذ جرمنی کی سرحد پر ہی یا ملک کے اندر ہوگا۔

جنگ کے میدانوں میں جرمنی کی پسپائی کا نتیجہ اس کی سیاست پر بھی پڑا ہے اب ہنگری کے سوا جرمنی کے تمام ساتھی اس سے الگ ہو گئے ہیں، اٹلی بالکل اتحادیوں کے ساتھ ہو گیا ہے اور رومانیہ اور بلغاریہ روس کی طرف سے جرمنی کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ سیاسی انقلابوں سے سب سے زیادہ فائدہ روس نے اٹھایا ہے۔ فرانس اور اٹلی بے شک اتحادیوں کے ساتھ ہیں۔ مگر ان کے اپنے الگ مقاصد بھی ہیں اور جنگ کے بعد ان کی توجہ اپنے مقاصد پر ہوگی۔ روس جنگ کے بعد فن لینڈ، پولینڈ، چکوسلوواکیہ، رومانیہ، بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کی سیاست پر بالکل حاوی رہے گا۔ اس کے آثار ابھی سے نظر آرہے ہیں۔ روس چکوسلوواکیہ سے بیس سال کا معاہدہ کر چکا ہے، جس کے مطابق چکوسلوواکیہ کی خارجی سیاست روسی سیاست سے ہم آہنگ ہوگی۔ پولینڈ کی جلا وطن فوج ایسا معاہدہ کرنے پر تیار نہ تھی اس لئے روس نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے اور غالباً جنگ کے بعد پولینڈ کی حکومت ایسی پارٹی کے ہاتھ میں ہوگی جو کمیونسٹ نہ ہوئی تب بھی خارجی ہر مسئلہ میں روس کے مشورے پر عمل کرے گی۔ رومانیہ اور بلغاریہ میں روسی اس کا اہتمام کر رہے ہیں کہ ان کے مخالف ایک مدت تک حکومت پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں۔ انھیں یہ بھی گوارہ نہیں ہے کہ انگریز اور امریکی بلغاریہ کے داخلی معاملات میں کوئی حصہ لیں ۲۸ ستمبر کو انھوں نے قریب بیس انگریز اور امریکی فوجی افسروں کو جو بلغاریہ کے دارالسلطنت میں تھے ۲۴ گھنٹے میں ملک کو چھوڑ دینے کا حکم دیا، اور جب وہ موٹروں میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تو ان کے پیچھے روسی افسر سرحد تک گئے، تاکہ شبہے کی گنجائش نہ رہے۔ اب اتحادی فوجیں البانیہ میں اتاری گئی ہیں ان کا مقصد یوگوسلاویہ کی مدد کرنا ہے اور ان جرمنوں کا راستہ روکنا جو اب تک کریٹ اور یونان میں رہیں۔ اس چال کا سیاسی نتیجہ یہ ہوگا کہ یونان پر روس کا سیاسی تسلط نہ ہوگا۔ یوگوسلاویہ میں روسیوں نے پہلے ہی سے اپنے قدم جمائے ہیں، اور بلغاریہ کو بھی وہ اس طرح اپنے قابو میں رکھیں گے کہ کوئی کارروائی عمل میں نہ آنے پائے جو ان کی مصلحت یا مفاد کے خلاف ہو۔

جب تک یورپ میں جنگ ہو رہی ہے انگریز اور امریکی روس کے رویے پر اعتراض نہ کریں گے۔ انھوں نے اصولاً نہیں تو عملاً تسلیم کر لیا ہے کہ استھونیا، لیتویہ اور لیتھونیا روسی وفاق کے ارکین یعنی روس میں شامل ہیں۔ پولینڈ کے معاملات میں مسٹر چرچل نے ہمیشہ روس کا ساتھ دیا ہے، اور پولینڈ کی نئی حد بندی کی تجویز منظور

کرلی ہے، اگرچہ مسٹر چمبرلین نے ۱۹۳۹ء میں پولینڈ کو جو گارنٹی دی تھی اس میں پولینڈ کی اس وقت کی حدود کو قائم رکھنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ چکوسلواکیا سے روس کا جو معاہدہ ہوچکا ہے وہ اس بین الاقوامی نظام سے الگ ہوگا جو اتحادی جنگ کے بعد قائم کریں گے جس کا مطلب یہ ہے کہ چکوسلواکیہ اور اس کی بدولت وسطی یورپ کے مسائل میں روسیوں کا اختیار اتحادیوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوگا۔ فی الحال مسٹر چرچل کو یہ بھی منظور ہے، پارلیمنٹ میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے وہ یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ جرمنی سے بغیر کسی شرط کے ہتھیار ڈالنے کو کہا جائے گا، چاہے اس کا نتیجہ یہ ہو کہ جرمنی میں انقلاب ہوجائے اور کمیونسٹ حکومت پر قبضہ کرلیں۔ گویا مسٹر چرچل نے یہ خیال چھوڑ دیا ہے کہ یورپ میں آزاد اور خودمختار ریاستوں کے درمیان قوت کا ایسا توازن قائم کیا جائے کہ جنگ کی نوبت نہ آنے پائے۔ اور اس کی جگہ انھوں نے ایسی کوئی تجویز سوچی ہے کہ برطانیہ، روس اور امریکہ مشترکہ طور پر سیاسی اور معاشی نگرانی کے فرائض انجام دیں۔ اور یورپ کی تمام قومیں انھی تینوں کے ماتحت رہیں۔ اس تجویز کی کامیابی کے لئے لازمی ہے کہ متحدہ ریاستیں یورپ کی سیاسی رہنمائی کی پوری ذمہ داری لیں اور وہ دوسری اور خرچ برداشت کریں جو یورپ جیسے براعظم کو قابو میں رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ پریزیڈنٹ روزولٹ اور ان کے وزیر اس کے لئے تیار ہیں لیکن غالباً جنگ ختم ہونے کے بعد کانگرس اور امریکہ کے سرمایہ دار متحدہ ریاستوں کی سیاست کو حکومت کے اختیار میں نہ رہنے دیں گے اور پریزیڈنٹ روزولٹ منتخب ہوگئے تب بھی جنگ کے بعد متحدہ ریاستوں کا رویہ ضرور بدلے گا۔ ایک فرقہ، جو اصولی بحث کرتا ہے یہ کہے گا کہ جب روس کو ایسی ریاستوں پر قبضہ رکھنے کا حق دیا گیا ہے جو جنگ سے پہلے آزاد تھیں اور اس کے باقی پڑوسی بھی اس کے ماتحت کردیے گئے ہیں تو متحدہ ریاستیں کس اصول پر یورپ کے معاملات میں دخل دے سکتی ہیں اور ان سے کس نصب العین کی خاطر سیاسی نگرانی کی زحمت اٹھانے کو کہا جاسکتا ہے۔ متحدہ ریاستیں قوموں کی آزادی کی حفاظت اور ان اصولوں کی حمایت کرسکتی ہیں جن سے قوم کو عقیدت ہے، دوسروں کی اغراض پوری کرنا ان کا کام نہیں۔ دوسرا فرقہ، جس میں سرمایہ دار ہوں گے جنگ کی کامیابیوں سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ ابھی سے ایک غیر سیاسی مگر بہت طاقتور فرقے کے لوگ کہہ رہے ہیں کہ متحدہ ریاستوں کو بحرالکاہل کے ان جزیروں پر قبضہ رکھنا چاہیئے جو انھوں نے فتح کئے ہیں اور ظاہر ہے جنوب مشرقی ایشیا میں امریکی فوجوں کو جتنی کامیابی ہوگی اسی

نسبت سے ایسے لوگوں کے مطالبے بڑھتے جائیں گے ۔ اور تجارتی فائدے کے مقابلے میں اپنے اتحادیوں کے سیاسی احساسات کا ذرا بھی خیال نہ کریں گے۔ ایسی حالت میں متحدہ ریاستوں کا کسی واضح اور مستقل پالیسی پر عمل کرنا بہت دشوار ہوگا، اور برطانیہ اور روس ہی یورپ میں امن قائم رکھنے کے ذمہ دار ہوں گے روس اپنے اقتدار کو مستحکم کر رہا ہے۔ اور وسطی، مشرقی یورپ پر وہ حاوی رہے گا۔ برطانیہ کا اثر جتنا بھی ہوگا نورٹیے، سویڈن، فرانس، ہسپانیہ، اٹلی اور یونان میں ہوگا۔ قوت کے اس توازن میں فیصلہ کن بات ہوگی کہ جرمنی کی صنعت پر کس کا قبضہ ہوتا ہے۔

(۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۴ء) (م۔م)

(ب) ہندوستان

گاندھی جناح کی گفتگوئے مصالحت

مہاتما گاندھی اور قائد اعظم جناح کی گفتگو افسوس ہے کہ بلا کسی نتیجہ پر پہنچے ہوئے فی الحال منقطع ہو گئی ہے۔ ترقی پسند حلقوں میں اس کے ساتھ بڑی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں اور رجعت پسند حلقوں میں اس کی وجہ سے بڑی پریشانی اور سراسیمگی تھی۔ ترقی پسند حلقے عام طور پر مسلمانوں کے حق خود ارادیت کے حامی تھے اور ان کا خیال تھا کہ چونکہ کانگریس ورکنگ کمیٹی اس بات کو ایک حد تک تسلیم کر چکی ہے[1] اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس کی جانب ایک بڑا قدم اٹھا چکی ہے[2]۔ اور گاندھی جی نے راجہ جی کے فارمولے[3] کو قبول کر کے مسلمانوں کے پاکستان کے حق کو مان لیا ہے اس لئے اب مسلم لیگ کی لاہور کی

---

[1] کرپس سے جب ہندوستان کے دستور کا معاملہ طے ہو رہا تھا تو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کہا تھا کہ "وہ ملک کے کسی واحدہ کے لوگوں کو ان کی اعلان کردہ اور مسلمہ مرضی کے خلاف، سلطنت مشترکہ ہند میں شریک رکھنے کے لئے مجبور کرنے کا خیال تک بھی دل میں نہیں لا سکتی" جس کا مفہوم گویا یہ تھا کہ گو کانگریس مشترکہ ہندوستان کی حامی ہے لیکن اگر

قرارداد کے تسلیم کرنے میں بہت کم رکاوٹ رہ گئی ہے اور اس کو باہمی گفتگو سے دور کیا جا سکتا ہے۔

لیکن گفتگو کی جو روداد باہمی مراسلت کی صورت میں شائع ہوئی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش اعتقاد لوگ غلط فہمی میں مبتلا تھے دراصل دونوں رہنماؤں کے خیالات میں بنیادی فرق پایا جاتا تھا جس کا مصالحت کی گفتگو سے دور کرنا ممکن نہیں تھا۔ گاندھی جی ہندو مسلم مشترکہ قومیت کے عقیدہ پر قائم تھے، جناح صاحب ہندوؤں اور مسلمانوں کو بنیادی طور پر دو جداگانہ قومیں تسلیم کرتے تھے گاندھی جی ہندوستان کی ایسی تقسیم چاہتے تھے جیسی دو بھائیوں کے درمیان ہوتی ہے کہ اندرون خانہ تو وہ ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن باہر والوں کے مقابلہ میں وہ پھر بھی متحد ہی رہتے ہیں جناح صاحب پاکستان کو بالکل مختار مطلق ریاست بنانا چاہتے تھے جو اپنی مدافعت۔ خارجی پالیسی، تجارت ذرائع آمد و رفت وغیرہ کا انتظام بذات خود جداگانہ اور آزادانہ طریقہ پر کرے اور اس سلسلہ میں صرف ان ضروری پابندیوں کو قبول کرے جو آزاد اور خود مختار پاکستان اور ہندوؤں کے درمیان باہمی معاہدے سے طے پائیں۔ جناح صاحب مسلم قوم کے لئے خود ارادیت کے حق کے طلبگار تھے۔ گاندھی جی مسلم علاقوں کے لئے اس حق کو ماننے کے لئے تیار تھے۔ جناح صاحب صرف مسلم قوم کی رائے کو فیصلہ کن قرار دیتے تھے گاندھی جی مسلم اکثریت کے علاقوں کی پوری بالغ آبادی کی جس میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہوں۔ عام رائے معلوم کرنا چاہتے تھے۔ جناح صاحب تقسیم کو مقدم اور آزادی کو موخر رکھتے تھے

(بقیہ نوٹ صفحہ) مسلمان چاہیں گے تو وہ علیحدہ بھی رہ سکیں گے

[1] بمبئی کے ۸ اگست کے تاریخی اجلاس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے وفاق میں شامل ہونے والے واحدوں کے لئے بیش ترین خود مختاری کو جائز رکھا تھا اور باقی اختیارات انہی واحدوں کے حوالے کر دیے تھے اور اس سلسلہ میں گاندھی جی مسٹر جناح سے ملاقات بھی کرنے والے تھے لیکن ان کی گرفتاری کی وجہ سے یہ ملاقات نہیں ہو سکی تھی

[2] راجہ جی کا فارمولا چھ نکتوں پر مشتمل تھا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کو ہندوستان کی مکمل آزادی کے مطالبہ کی تائید کرنا ہوگی اور درمیانی زمانہ کے لئے ایک قومی حکومت کے بنانے میں کانگریس کے ساتھ اتحاد عمل کرنا ہوگا۔ جنگ کے خاتمہ

گاندھی جی آزادی کو مقدم اور تقسیم کو موخر رکھتے تھے۔ جناح صاحب مسلم لیگ کے با اختیار نمائندہ کی حیثیت سے گفتگو کر رہے تھے گاندھی جی صرف ذاتی حیثیت سے گفتگو کر رہے تھے۔ جناح صاحب ہندو قوم سے سمجھوتہ چاہتے تھے اور مسٹر گاندھی کو مسلم لیگ کی قرارداد سمجھانا اور ان کو مسلم لیگ کا ہم خیال بنانا چاہتے تھے گاندھی جی جناح صاحب سے سمجھوتہ چاہتے تھے تاکہ بعد میں دونوں مل کر ساری قوم کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کریں اور آزادی کے حصول کی مشترکہ سعی کر سکیں۔ مسٹر جناح کے اندر قطعیت وضاحت اور سختی تھی مسٹر گاندھی میں ابہام، لچک اور نرمی تھی لیکن نہ اتنی کہ مسٹر جناح کی مسلسل کاری ضربوں کی غیر محدود مدت تک متحمل ہو سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تین ہفتے تک طول کھینچنے کے بعد آخر کار یہ گفتگو ناکامی کے ساتھ ختم کرنا پڑی۔

لیکن اس گفتگو کو بے کار اور مضرت رساں سمجھنا صحیح نہیں ہے اس کے ذریعہ ترقی کی طرف بلاشبہ ایک نہایت اہم قدم اٹھایا گیا ہے اس کے ذریعہ عوام کی نہایت اچھی سیاسی تعلیم ہوئی ہے۔ مورتیں جس طرح واضح صورت میں سب کے سامنے آگئے ہیں ایسے پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ گاندھی جی نے اس گفتگو کی

(بقیہ نوٹ صفحہ) پر ایک کمیشن ان علاقوں کی حد بندی کرے گا جنھیں عام رائے شماری کے فیصلہ کے ذریعہ ہندوستان سے علیحدہ کیا جائے گا آبادی کی جبری منتقلی اختیاری ہوگی اور ان تمام شرطوں پر اس وقت عملدرآمد ہوگا جب برطانیہ مکمل طور پر حکومت ہند کو خود مختار بنا دے گا۔

؎ قرار پایا کہ مسلم لیگ کے اس جلسہ کا غور و خوض کے بعد خیال ہے کہ کوئی دستوری تجویز اس وقت تک اس ملک میں لائق عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگی جب تک کہ اسے مندرجہ ذیل بنیاد پر نہیں سوچا جائے گا یعنی یہ کہ جغرافیائی لحاظ سے جو واحدے ایک دوسرے سے ملحق ہیں ان کی علاقوں کی صورت میں حد بندی کر دی جائے اور ان کو ضروری علاقہ وار تبدیلیوں کے ساتھ اس طرح دستوری شکل دے دی جائے کہ وہ علاقے جہاں مسلمان تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی و مشرقی حلقے، انھیں متحد کر کے ایسی آزاد ریاستوں کی صورت دے دی جائے جس میں شامل ہونے والے واحدے خود مختار اور اعلیٰ اقتدار کے مالک ہوں گے" نیز یہ کہ ان واحدوں اور ان علاقوں کی اقلیتوں کے لئے کافی موثر اور دستوری ضمانتوں کا مخصوص طور پر بندوبست

آخری منزل میں اپنی طرف سے مصالحت کی جو تجویز[1] پیش کی وہ بہت واضح اور غیر مبہم تھی اور جناح صاحب نے اس تجویز کو لاہور کی قرارداد کے منافی قرار دے کر جس طرح مسترد کیا اس میں بھی بہت صراحت اور صفائی پائی جاتی ہے

بہرحال اس تمام گفتگو کا اہم ترین سوال یہ تھا کہ آیا مسلمانوں کا ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے حق خود ارادیت تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ جناح صاحب یہ کہتے تھے کہ یہ حق جداگانہ قوم کی حیثیت سے تسلیم کرنا چاہیے اور گاندھی جی جداگانہ قوم کی حیثیت سے اس حق کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ جناح صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ برطانوی ہند میں ہندوستانی قوم کا کہیں کوئی وجود نہیں ہے اس سلطنت میں مسلم قوم آباد ہے اور ہندو قوم بھی آباد ہے لیکن ہندوستانی قوم جسے کہتے ہیں وہ ہرگز نہیں ہے۔ ہندوستان کے مسلمان نو سو سال سے ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے ہندوستان میں ہیں۔ آٹھ سو سال تک وہ یہاں حکمراں کی حیثیت سے رہے پھر وہ محکوم ہو گئے لیکن قومیت کے ہر لحاظ سے انھیں ایک جداگانہ قوم کہا جا سکتا ہے۔ ان کی آبادی دس کروڑ ہے ان کا ایک جداگانہ تمدن اور تہذیب ہے، جداگانہ زبان اور ادب ہے، جداگانہ فن لطیف اور طرز

(بقیہ نوٹ صفحہ) کیا جائے تاکہ ان کے مذہبی، تمدنی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق اور مفاد کا تحفظ ان کے مشورے سے کیا جا سکے اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کے لئے اور دوسری اقلیتوں کے لئے کافی موثر اور دستوری ضمانتوں کا مخصوص طور پر بندوبست کیا جائے تاکہ ان کے مذہبی تمدنی، معاشی سیاسی انتظامی اور دوسرے حقوق اور مفاد کا تحفظ ان کے مشورہ سے کیا جا سکے "

[1] آپ کی مدد سے میں سمجھوتے کے امکانات ڈھونڈھنے کی انتہائی کوشش کر رہا ہوں تاکہ لاہور کی مسلم لیگ کی قرارداد میں جو مطالبہ پیش کیا گیا ہے اس کو معقولیت کے ساتھ پورا کیا جا سکے اس لئے آپ کو یہ اندیشہ نہ کرنا چاہیے کہ اگست کی قرارداد ہمارے سمجھوتہ کی راہ میں حائل ہو گی۔ اس قرارداد میں ہندوستان اور برطانیہ کے اختلاف کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور یہ ہمارے سمجھوتے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔

میں اس مفروضہ سے ابتدا کرتا ہوں کہ ہندوستان کو دو یا زائد قومیں قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ اسے ایک خاندان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس میں بہت سے رکن شامل ہیں اور اس میں مسلمان جو شمال مغرب کے علاقہ یعنی بلوچستان، سندھ، شمال مغربی

عبارت ہے، جداگانہ نام اور اصطلاحیں ہیں، جداگانہ احساس قدر وتناسب ہے، جداگانہ رواج اور جنتری ہے، جداگانہ تاریخ اور روایات، جداگانہ رجحانات اور عزائم ہیں۔ غرض ان کا زندگی کے بارے میں اور زندگی سے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نگاہ ہے اور بین الاقوامی قانون کے ہر اصول کے لحاظ سے انھیں ایک جداگانہ قوم کہا جا سکتا ہے اس قدر کثیر التعداد قوم کو یہ جمہوری حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مکمل آزادی کو عمل شکل دینے کے لئے ایک سرزمین وطن کا مطالبہ کرے۔ چونکہ اس کی تعداد کل سلطنت ہند کی آبادی کی ایک چوتھائی ہے اس لئے برطانوی محکومیت سے آزاد ہونے کے وقت اس سلطنت کے ایک چوتھائی رقبہ پر مطالبہ کرنے کا اس کو جائز حق حاصل ہے اپنے اس حق کی بنا پر مسلم قوم اپنے لئے حیدرآباد بمبئی اور مدراس کی طرف بھی ایک چوتھائی رقبہ کا مطالبہ کرسکتی تھی۔ اور اس مطالبہ کے جواز میں بہت سی باتیں پیش کی جاسکتی تھیں۔ لیکن ایسا کرنے میں ملک کی زندگی میں نسبتاً زیادہ ابتری پیدا ہوتی ۔ حسن اتفاق سے مسلم قوم کی بیشتر آبادی ملک کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں میں مجتمع ہے اس لئے مسلم لیگ کا مطالبہ ہے کہ ان دونوں جانب کے علاقوں کو مسلمانوں کی سرزمین وطن تسلیم کرلیا جائے۔ اس میں سلطنت برطانیہ کے موجودہ صوبوں میں سے

(بقیہ نوٹ صفحہ) سرحدی صوبہ اور پنجاب کے ایک حصہ میں رہتے ہیں اور جہاں وہ دوسرے عام عناصر کے مقابلہ میں قطعی اکثریت میں ہیں اور بنگال اور آسام کے ان حصوں میں جہاں وہ قطعی اکثریت میں ہیں۔ بقیہ ہندوستان سے علیحدہ رہنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

عام بنیاد کے بارے میں آپ سے اختلاف رکھنے کے باوجود میں پھر بھی کانگریس اور ملک سے اس بات کی سفارش کرسکتا ہوں کہ مسلم لیگ کے علیحدگی کے مطالبہ کو جو لاہور کے سنہ ۱۹۴۰ء کی لیگ کی قرارداد میں موجود ہے میری بنیاد پر اور مندرجہ ذیل شرائط کے ماتحت قبول کیا جائے۔

علاقوں کی حدبندی ایک ایسا کمیشن کرے جس کو کانگریس اور مسلم لیگ پسند کریں۔ حدبندی کئے جانے والے علاقوں کے باشندوں کی خواہشات کا پتہ ان کی بالغ آبادی کی رائے شماری کے ذریعہ یا اس کے مساوی کسی دوسرے اور ذریعہ سے کیا جائے۔

شمال مغرب میں سندھ بلوچستان ۔ سرحدی صوبہ اور پنجاب کو شامل کرنا ہوگا اور شمال مشرق میں صوبہ بنگال کو اور صوبہ آسام کے ایک حصہ کو۔ لاہور کی قرارداد میں حد بندی کرتے وقت تھوڑی سی علاقہ وار ترمیم و تنسیخ کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ لیکن وسیع نقطہ نگاہ سے یہ تقسیم ہے جس کا مسلم لیگ کی طرف سے مطالبہ ہے اور یہ علاقے ہیں جن پر شمال مغربی اور شمال شرقی پاکستان مشتمل ہوگا ۔

جناح صاحب نے گاندھی جی کی آخری تجویز پر جو اعتراض کئے ان میں نہایت پرمعنی اعتراض یہ تھا کہ گاندھی جی پاکستان کو صرف ان مسلم اضلاع تک محدود رکھنا چاہتے ہیں جہاں مسلمانوں کی قطعی اکثریت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناح صاحب کو یہ بات منظور نہیں ہے بلکہ وہ پاکستان میں بعض ان اضلاع کو بھی شامل کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جہاں اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت نہیں ہے لیکن جو اس وقت پنجاب اور بنگال کے موجودہ برطانوی صوبوں میں شامل ہیں کیونکہ ان کا شمول وہ پاکستان کی زندگی کو مکمل کرنے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں انھوں نے گاندھی جی کی حد بندی کی تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ "اگر آپ کی شرط کو منظور کر لیا جائے اور اس کو عملی جامہ پہنایا جائے تو ان صوبوں کی موجودہ حدود ناقابل علاج حد تک مجروح

(بقیہ نوٹ صفحہ) "اگر رائے علیحدگی کی موافقت میں ہو تو اس بات پر اتفاق کیا جائے کہ یہ علاقے ہندوستان کے غیر ملکی تسلط سے آزاد ہونے کے بعد جس قدر جلد سے جلد ممکن ہو سکے گا ایک علیحدہ ریاست بن جائیں گے اور دو مختار مطلق آزاد ریاستوں کی صورت اختیار کر لیں گے

"علیحدگی کے وقت ایک معاہدہ کیا جائے گا جس میں معاملات خارجہ، مدافعت، داخلی نقل و حمل اور خبر رسانی، کروڑگیری، تجارت اور اس قسم کے دوسری چیزوں کے معقول اور اطمینان بخش انتظامات کو ملحوظ رکھا جائے گا کیونکہ یہ جملہ معاملات ایسے ہیں جن میں لازمی طور پر شریک معاہدہ فریقوں کے مشترکہ مفاد علیحدگی کے بعد بھی جاری رہیں گے

" اس معاہدہ میں ایسی شرائط بھی ہوں گی جن کے ذریعہ دونوں ریاستوں کی اقلیتوں کے تحفظ کو بھی ملحوظ رکھا جائے گا ۔

جب کانگریس اور لیگ اس سمجھوتہ کو قبول کر لیں گی تو اس کے فوراً بعد یہ دونوں ہندوستان کی آزادی کے

اور مسخ ہو جائیں گی اور پاکستان کے پاس دانہ کی جگہ بھوسہ رہ جائے گا۔ یہ چیز لاہور کی قرارداد کے خلاف ہے۔ نیز آپ کی تجویز کی رو سے ان مسخ شدہ علاقوں میں بھی خود ارادیت کا حق صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہوگا بلکہ ان نئے حد بند علاقوں کے سارے باشندے اس میں شریک ہو سکیں گے۔ یہ چیز بھی لاہور کی قرارداد کے منافی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جناح صاحب پاکستان میں پنجاب اور بنگال کے موجودہ صوبوں کے بعض ان اضلاع کو بھی شامل رکھنا کیوں ضروری سمجھتے ہیں جن میں مسلمانوں کی قطعی اکثریت نہیں ہے بلکہ جس میں قطعی اکثریت غیر مسلموں کی ہے اس سوال کا جواب جناح صاحب کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ان صوبوں کی موجودہ حدود ناقابل علاج حد تک مجروح اور مسخ ہو جائیں گی اور پاکستان میں دانے کی جگہ بھوسہ رہ جائے گا۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ اضلاع معاشی حیثیت سے اہم ہیں اور ان کا پاکستان میں شامل رکھنا پاکستان کی مالی اور معاشی تکمیل اور استحکام کے لئے ضروری ہے۔

اس دلیل سے بحث کے اندر ایک نئے اور نہایت اہم عنصر کا اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ عنصر ایسا ہے جس کے بارے میں عام طور پر لوگوں کی معلومات اور واقفیت بہت کم ہے یہ عنصر ایسی چٹان ہے جس سے ٹکرا کر پاکستان کا جہاز ریزہ ریزہ اور غرق ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ پاکستان کے مالی اور معاشی پہلو کے بارے میں نہایت مکمل اور مفصل تحقیق کرائی جائے۔ ورنہ اس پہلو کو نظر انداز کر کے اگر کوئی سمجھوتہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے پاکستان کا قبول کرنا "دانہ کی جگہ بھوسہ" کے قبول کرنے کے مرادف ثابت ہوگا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ مسلم لیگ نے اس قسم کی کوئی باقاعدہ اور اطمینان بخش تحقیقات کرائی ہے یا نہیں اور مسلم لیگ کی طرف سے جو منصوبہ ساز کمیٹی بنائی گئی ہے اس کے حدود مطالعہ میں یہ چیز بھی شامل ہے یا نہیں۔ اخبارات میں اس کی حدود تحقیقات کے بارے میں جو اطلاعات شائع ہوئی ہیں ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منصوبہ ساز کمیٹی موجودہ غیر

(بقیہ نوٹ صفحہ) لئے مشترکہ طریقہ عمل کے بارے میں فیصلہ کریں گی۔

لیکن لیگ کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو اس براہ راست اقدام سے علیحدہ رکھے جس کو کانگریس تو شروع کرے لیکن جس میں لیگ شریک نہ ہونا چاہے"۔

منقسم ہندوستان کے لئے عام طور پر اور ان صوبوں کے لئے جو آئندہ پاکستان میں شامل ہونے والے ہیں خاص طور پر ایک معاشی منصوبہ تیار کرے گی لیکن یہ بات کہ وہ پاکستان کو آزاد اور خود مختار سمجھ کر اس کی کوئی ایسی حدبندی بھی تجویز کرے گی جو اس کی مالی اور معاشی آزادی اور استحکام کے لئے ضروری ہے کسی اطلاع سے ثابت نہیں ہوتی۔ بہرحال اگر مسلم لیگ کی طرف سے اس قسم کی تحقیقات کرائی جا چکی ہے اور وہ اطمینان بخش ثابت ہو چکی ہے تو اس کے نتائج کو پبلک کے سامنے بہت جلد اور بہت وسیع پیمانے پر لانے کی ضرورت ہے تاکہ لیگ کے مطالبہ کا لائق عمل ہونا بھی لوگوں پر اچھی طرح واضح ہو سکے۔

(۴ر اکتوبر ۱۹۴۵ء) (م۔ ع)

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر ۹ کلایو اسٹریٹ ، کلکتہ

سرپرست

عالی جناب ہزہائنس آغا خاں صاحب　　**عالی جناب ہزہائنس نواب صاحب بھوپال**

مجوزہ سرمایہ	۶۰ لاکھ روپے	۶۰۰۰۰۰۰
جاری شدہ سرمایہ	بائیس لاکھ چوالیس ہزار ساٹھ	۲۲۴۴۰۶۰
ادا شدہ سرمایہ	گیارہ لاکھ چھ ہزار چھ سو پانچ	۱۱۰۶۶۰۵

اپنے بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے۔ ایسٹرن فیڈرل ، آگ ، زندگی ، رسل ورسائل ، موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات ، مزدوروں کا مالی معاوضہ ضمانت اور عام حادثات کے ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمایندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں :—

لندن ، لاہور ، بمبئی ، حیدر آباد دکن ، احمد آباد

فلسطین (TEL-VIV)

جلن سوزش اور خراش



جلن خفیف وہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک بھی ہوتی ہے۔ سگرٹ سے انگلی کی معمولی جلن کے علاج پر بھی اگر توجہ نہ کی جائے تو اس سے خون میں زہر پھیل جانے کا خطرہ پیدا ہوتا ہے، جب ہی آپ کسی شے سے جل جائیں آپ جلنے کی جگہ پر فوراً **جلمار** لگا دیجئے۔ خواہ آپ آگ سے جلے ہوں یا کھولتی ہوئی کسی تیل شے سے، جلمار فوراً درد کو دور کر دے گا۔ چونکہ اس میں تیز (لیکن سوزش نہ کرنے والے) مصفّی اجزا شامل ہوتے ہیں اس لئے اس کے استعمال سے جراثیم نہیں پیدا ہونے پاتے، یہ چھالے بھی نہیں پڑنے دیتا۔ مزید براں اس سے جلے ہوئے مقام پر بہت جلد نئی کھال پیدا ہو جاتی ہے۔

ہر قسم کی جلن اور سوزش کو ٹھنڈک اور آرام پہنچانے کے لئے **جلمار** اپنی مثال نہیں رکھتا۔ اس بات کا خیال رکھئے کہ **جلمار** ہمیشہ آپ کے گھر میں موجود رہے۔ بجائے اس کے کہ خون میں زہر پھیل جانے کے علاج پر کثیر رقم صرف کی جائے، یہ زیادہ بہتر ہے کہ جلنے سے جراثیم نہ پیدا ہونے دے جائیں۔

آج ہی اپنے قریب دواساز یا اسٹور سے اس کا ایک ٹیوب خرید لیجئے۔

آج ہی ایک ٹیوب خرید لیجئے
معلوم نہیں کس وقت
اس کی آپ کو ضرورت پڑ جائے



جلمار

جلن اور سوزش کو آرام پہنچاتا ہے

سارے دواسازوں اور اسٹوروں سے دستیاب ہو سکتا ہے

سپلا بائیکلہ بمبئی

[redacted]

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۴ نمبر ۲	بابتہ ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۴ء	سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸/

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے آکسن، محبوب المطابع پریس دہلی

پاکستان ایک حیات بخش نصب العین کی حیثیت سے

نصب العین کی بلندی افراد اور قوم کی خوابیدہ صلاحیتوں کے بیدار کرنے میں بہت معاون ثابت ہوتی ہی۔ اگر صرف ان چیزوں پر قناعت کرنے کی عادت ڈال لی جائے جو آسانی سے دستیاب ہوسکتی ہیں تو پھر فرد اور قوم کے اندر سہولت پسندی کاہلی اور جمود پیدا ہو جاتا ہی اور یہ بات ان کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہی۔ لیکن اگر نصب العین بلند رہے اور اس کے حاصل کرنے کے لئے مسلسل جد و جہد اور کشمکش کرنا پڑے تو جسمانی اور دماغی قوتوں کی برابر ورزش ہوتی رہتی ہے اور اپنی طاقت اور اپنی ترقی کے امکانات کے بارے میں روز بروز نیا اعتماد پیدا ہوتا رہتا ہی اور نئے تجربے اور اقدام کرنے کا حوصلہ اور نئے مقاصد کو حاصل کرنے کی تمنا اور ہمت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہی ؎

ہمت بلند دار کہ نزد خدا و خلق
باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

اس لئے اولوالعزمی، بلند حوصلگی کوئی بُری چیز نہیں ہے بلکہ بعض انتہا پسند مفکروں اور شاعروں کے نزدیک تو نصب العین کے حصول کو ثانوی حیثیت حاصل ہی اور انھوں نے اصل چیز صرف اس جہد و کوشش، تپش و بیتابی، جستجو و خلش، سعی و سرگرمی کو قرار دیا ہے جو آدمی اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے جاری رکھتا ہے۔ اسی کا نام زندگی ہے۔ قیام، قرار، سکون منزل، حصول مقصد موت ہیں یا موت کی نشانیاں ہیں ؎

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو تابندہ ایم

اسی لئے یہ لوگ کسی معین نصب العین کے قائل نہیں ہیں بلکہ اسے مبہم، پُر اسرار اور سماوی رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک نصب العین کو ہمیشہ گرفت بلکہ رسائی سے بلند و بالا رہنا چاہیئے۔ پھر ایسے افراد اور اقوام کے لئے جو جسمانی لحاظ سے مضبوط، جاندار، مشقت پسند اور سخت کوش ہوں اور دماغی لحاظ سے اثر پذیر، لوچ دار اور سادہ لوح ہوں تو اسے خاص طور پر غیر واضح سحابی اور سرمدی ہونا چاہیئے۔

سرحد و پنجاب و سندھ اور بنگال کے وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور جن کے لئے پاکستان تجویز کیا جا رہا ہے اپنے اندر انسانی وسائل کے نہایت زبردست خزانوں کو چھپائے ہوئے ہیں۔ صاحب بصیرت افراد کو شمال مغربی علاقہ کے بارے میں تو اس بات کے تسلیم کرنے میں بہت کم تامل ہوگا۔ البتہ شمال مشرقی علاقہ کا معاملہ انھیں مشتبہ معلوم ہوگا۔ صدیوں کے جور و ظلم اور فاقہ و بیماری نے اس مرطوب، زرخیز اور ضعف آور علاقہ کی کثیر التعداد آبادی کو جسمانی حیثیت سے اس قدر کمزور کر دیا ہے کہ اس کے بارے میں کسی خوش آئند مستقبل کی بشارت دینا ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے۔ بنگال کے کاشتکار پر غلامی اور استحصال کا بوجھ صدیوں سے لدا چلا آرہا ہے جس نے اس کی کمر کو جھکا کر دوہرا کر دیا ہے اور اسے بار برداری کا جانور بنا دیا ہے کیا یہ اپنی کمر کو سیدھا کر کے ایک انسان کی طرح کھڑا ہو سکے گا؟ اس کی موجودہ حالت کو دیکھ کر اس بات کا یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن ذرا اس کو اپنی گردن کا جوا اپنی کمر کا بوجھ اتار کر پھینکنے دو پھر دیکھنا بنگالی مسلمان کی دبی ہوئی ذہنی چنگاریاں کن کن راہوں سے سلگ کر شعلہ زن ہوتی ہیں۔ اگر بنگال کے ہندو، ہندوستان کے لئے بہترین دماغ مہیا کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ بنگال کے مسلمان بھی اسی پایہ کے ادیب، فن کار اور سائنس داں کیوں نہ پیدا کر سکیں گے؟ انھیں موقع ملنا شرط ہے پھر ان کے جوہر بھی چمکیں گے اور جتنے دبائے

گئے ہیں اتنے ہی زیادہ اُبھریں گے۔ بنگالی مسلمان تباہ وخستہ حال ضرور ہیں لیکن زوال زدہ اور فنا پذیر نہیں ہیں۔ ان کی آبادی کم نہیں ہورہی ہے ان کی نسل ترقی پذیر ہے۔ وہ باقی رہنا اور کچھ کرکے دکھانا چاہتی ہے اگر سرحد و پنجاب کے کاشتکار و گلہ بان کا شمار، خشکی کی لڑائی میں دنیا کے بہترین سپاہیوں میں ہوتا ہے تو بنگال کے ماہی گیر (لسکر) کا بھی دنیا کے بہترین ملاحوں میں شمار کیا جاسکتا ہے ؎

ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں لیکن
وقت آنے دو وقت آنے پھر تم کو بتا دیں گے

سرحد و پنجاب کے سپاہی اور بنگال کے لسکر کو اس وقت کرائے کے لڑنے والے کا طعنہ دیا جارہا ہے اور واقعہ کچھ ہے بھی ایسا ہی۔ لیکن یورپ کی وہ قومیں جو آج کل ممتاز و سربلند نظر آرہی ہیں وہ ایک زمانے میں جب کہ ان کا شمار وحشیوں اور بربروں میں ہوتا تھا، رومیوں کے لئے بھاڑے کے ٹٹو کی حیثیت سے کام کرچکی ہیں۔ تاریخ ایسی مثالیں بارہا پیش کرچکی ہے جس میں آج کے کرایہ کے لڑنے والے کل کے حکمراں ثابت ہوئے ہیں۔ اس لئے اس قسم کا طعنہ دینے میں احتیاط سے کام لینا ہی مناسب ہے۔

بہرحال پاکستان کے نصب العین کی مطلق اور مجرد افادیت، رومانیت اور موزونیت سے ہرگز انکار نہیں ہے سوال صرف یہ ہے کہ کیا پاکستان کے لئے محض ریزولیوشن پاس کرتے رہنا اور اس کی رٹ لگائے جانا کافی ہے یا اس کے لئے کچھ کام کرنا بھی ضروری ہے کیا یہ ہمیں برطانیہ اور ہندوؤں کی طرف سے کرسمس کے تحفہ یا دیوالی کے پرشاد کے طور پر بخش دیا جائے گا۔ اور ہمارے لنچ اور ڈنر، کاک ٹیل اور ڈانس، گپ اور فقرہ بازی، قہقہے اور چہچہے حسب دستور سابق جاری رہیں گے یا اس کے حاصل [illegible] کے لئے ہمیں محنت کرنا اور مشقت اٹھانا پڑے گی، اپنے صبر [illegible] استقلال واستقامت [illegible] امتحان دینا ہوگا، عزیز ترین [illegible] وں کی قربانی چڑھانا ہوگی، آنسو بہانا ہوں گے اور آگ اور خون کے دریاؤں میں کودنا [illegible] ور

انھیں پار کرنا ہوگا۔

زندگی میں سکون اور ثبات نہیں ہے۔ یہاں کی ہر چیز متغیر اور انقلاب پسند ہے۔ زندگی ایک مسلسل دعوت مقابلہ، ایک دائمی چیلنج ہے۔ آج جو مفتوح ہے وہ کل فاتح ہوسکتا ہے، آج جو غلام ہے وہ کل مالک ہوسکتا ہے، آج جو غریب ہے وہ کل امیر ہوسکتا ہے۔ لیکن مواقع کو وسیع کرنے کے لئے حملہ اور ان کو برقرار رکھنے کے لئے مدافعت ضروری ہے۔ یہ حملہ اور مدافعت نہ صرف اپنے ہم نوع انسان بلکہ حشرات الارض، موسمی اثرات اور طبعی مظاہر کے خلاف بھی جاری رکھنا پڑتی ہے تب کہیں اپنا وجود قائم رکھا جاسکتا ہے اور اس میں جتنی زیادہ بیدار مغزی اور عاقبت اندیشی، مستعدی اور جفاکشی، ہمت اور استقلال، چستی اور چالاکی، تدبیر اور تنظیم سے کام لیا جاتا ہے اتنی ہی زیادہ کامیابی کی توقع قائم کی جاسکتی ہے۔ خصوصاً جب معاملہ محض مدافعت کا نہیں ہوتا بلکہ پیش قدمی اور ترقی، ہاتھ پھیلانے کی گنجائش نکالنے اور اعلیٰ تر معیار زندگی کے حاصل کرنے کا ہوتا ہے تو اس کے لئے جسم اور ذہن کی تمام بہترین قوتوں سے نہایت شدت اور تیزی سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

جو لوگ پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں کیا وہ ان ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہیں جو اس نعرہ لگانے سے ان پر عاید ہوتی ہیں؟ فرض کیجئے یہ نعرہ سکھوں اور پنجاب اور بنگال کے ہندوؤں کو اتنا ناگوار ہونے لگے کہ وہ اس کو بند کرانے کے لئے مرنے اور مارنے کے لئے آمادہ ہوجائیں اور حکومت برطانیہ غیر جانب داری سے کام لیتے ہوئے اور ملک کے اندر امن امان قائم رکھنے کے لئے اس نعرہ کو جرم قرار دے دے۔ فرض کیجئے لارڈ ویول جو ہندوستان کی جغرافی وحدت کے قائل ہیں پاکستان کے نعرہ کو باغیانہ قرار دے دیں تو پھر پاکستان کے کتنے حامی ایسے ہیں جو اس کے بعد بھی یہ نعرہ لگائیں گے اور اس کی پاداش میں سخت سزا برداشت کرنا فخر سمجھیں گے؟ ممکن ہے ایسے بہت سے لوگ موجود ہوں لیکن اس کا ابھی کوئی ثبوت نہیں ملا ہے پاکستان کے حامیوں کے لئے ابھی ابتلا اور آزمائش کی منزل سے گذرنا

باقی ہے انھیں اپنے عزم راسخ اور طلب صادق کا امتحان دینا ہے جب وہ اس امتحان میں پورے اتریں گے تب ان کی بات کا اعتبار کیا جائے گا۔

اس ابتدائی منزل میں کامیابی کے بعد ان کی ذمہ داریاں اور زیادہ بڑھ جائیں گی فرض کیجئے پاکستان کا حق مان لیا جاتا ہے تو انھیں موجودہ توازن وانتظام قانون اور حکومت کی جگہ اپنا نیا نظام علیحدہ قائم کرنا ہوگا انھیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑے گا۔ اپنے قوت بازو سے اپنی مدافعت کرنا ہوگی۔ دوسروں کا سہارا لینے کی جگہ دوسروں کو سہارا دینا ہوگا دوسروں کی حفاظت اور ضمانت طلب کرنے کی جگہ دوسروں کو اپنی حفاظت اور امان میں لینا اور ان کو پناہ دینا اور ان کی حمایت کرنا ہوگا وہ خود چین سے نہ سوسکیں گے انھیں دوسروں کو اپنی پاسبانی میں سلانا ہوگا۔ وہ خود عیش وآرام نہیں کرسکیں گے انھیں دوسروں کو عیش و آرام کرانا ہوگا۔ انھیں فکر و پریشانی، زحمت و مشقت خود قبول کرنا اور دوسروں کو ان سے آزاد کرنا ہوگا۔ ان کی زندگی حقوق و مراعات کا نہیں بلکہ فرائض اور ذمہ داریوں کا مجموعہ ہوگی انھیں غلط فہمیوں اور الزام تراشیوں، تہمتوں اور افترا پردازیوں، احسان فراموشیوں اور غیر رواداریوں کا شکار اور نشانہ بننا ہوگا۔ صبر و تحمل، ضبط اور بردباری عزم اور استقلال کے ساتھ تمام مخالفتوں کو برداشت کرنا اور ان کا مقابلہ کرنا ہوگا اور آخر میں مصالحت و مفاہمت کی کوئی صورت نکالنا ہوگی۔ یہ پاکستان کی دوسری منزل ہوگی۔

ان کی تیسری منزل یہ ہوگی کہ پاکستان کے وسائل کو پاکستان کے مسلمانوں کے مفاد میں ترقی دینے کا کام شروع کریں۔ ان کے پاس سرمایہ نہیں ہوگا ان کے پاس ماہر سائنس داں اور کارکن نہیں ہوں گے، ماہر منتظم نہیں ہوں گے۔ ضروری کچے مال نہیں ہوں گے۔ ایسی صورت میں انھیں غیر مسلموں اور غیر ملکوں سے مدد لینا ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ ان سے ان خدمات کا اس قدر زیادہ معاوضہ طلب کیا جائے کہ ان کے پلے کچھ بھی نہ پڑے۔ ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں ایسی سیاسی پارٹیاں برسراقتدار آجائیں جو ذاتی اور طبقہ وارانہ مفاد کو قومی مفاد پر نہ صرف مقدم رکھیں

بلکہ اس کے حصول کے لئے اسے قربان بھی کردیں تو پھر ان کا پاکستان بے کار ثابت ہوگا۔ جو چیز ایک ہاتھ سے انھوں نے بہ مشکل تمام حاصل کی تھی اسے دوسرے ہاتھ سے بہ آسانی دوسروں کے حوالہ کردیں گے ان اندیشوں کی موجودگی میں پاکستان کے حامیوں کو یہ بھی ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر پاکستان ان کو مل گیا تو وہ اس سے مناسب فائدہ اٹھانے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔

غرض پاکستان کا حاصل کرنا کوئی کھیل نہیں ہے اس کے لیے دن اور رات سخت ترین محنت اور تیاری کی ضرورت ہے پاکستان کے حامیوں کو پاکستان کے موانع کا علم پاکستان کے مواقع سے زیادہ ہونا چاہیے اور ہر مانع کو دور کرنا اپنی زندگی کا مشن بنا لینا چاہیے۔ ابھی تک ان کی کوششیں تخریبی زیادہ اور تعمیری کم رہی ہیں۔ انھوں نے ہندوؤں سے بیزاری اور مخالفت تو پیدا کرادی ہے لیکن مسلمانوں میں باہمی یگانگت اور یک جہتی پیدا نہیں کرا سکے ہیں وہ ابھی تک مسلم لیگ کو پوری طرح ایک منظم اور منضبط جماعت میں تبدیل نہیں کر سکے ہیں۔ مدافعت اور حملہ دونوں میں منتشر اور پراگندہ گروہ اپنے والہانہ جوش و خروش اور کثرت تعداد کے باوجود ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ کامیابی کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ انھیں ایک باقاعدہ فوج میں تبدیل کیا جائے۔ انھیں جدید ترین اسلحہ اور سامان جنگ سے آراستہ کیا جاتے اور فن حرب کی تازہ ترین حکمت عملی اور سائنٹفک داؤں پیچ سے واقف کرایا جائے ان میں اتنا دم پیدا کیا جائے کہ وہ برسوں تک مقابلہ کو جاری رکھ سکیں۔ لیکن ان سب باتوں کے لیے محض شور و ہنگامہ کافی نہیں ہوتا بلکہ کئی نسلوں تک خاموش اور مسلسل تیاری کرنا پڑتی ہے

اگر مسلم لیگ سنجیدگی کے ساتھ پاکستان حاصل کرنے کا ارادہ رکھتی ہے تو اسے سب سے پہلے پاکستان کے نظام جماعت کے بارے میں ایک مفصل پروگرام شائع کرنا چاہیے یہ پروگرام ایسا ہونا چاہیے جو اپنے اندر ایک عام اپیل رکھتا ہو۔ اس کا مقصد صرف مسلمانوں کے لئے فواید اور مواقع حاصل کرنا نہ ہو بلکہ انصاف آزادی اور مساوات کی بنیاد پر ایک نیا نظام

معاشرت پیدا کرنا ہو کیونکہ دنیا کے کسی غیر مسلم کو پاکستان سے محض اس بنا پر ہرگز کوئی دلچسپی اور ہمدردی نہیں ہوسکتی کہ اس میں اقتدار کی جگہوں پر غیر مسلموں کی جگہ مسلم متمکن ہوں گے۔ اگر پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد نظام معاشرت بالکل ویسا ہی رہے جیسا کہ اس سے پہلے تھا یا جیسا کہ اس کو خاص طور پر وجود میں لائے بغیر قائم کیا جا سکتا تھا تو موجودہ انتظام کو برہم کرنا ایک غیر مسلم کو فضول اور بے فائدہ نظر آئے گا ایک مسلمان کو مجلس قانون ساز اور مجلس عاملہ میں غیر مسلم ناموں اور صورتوں کی جگہ مسلم نام، صورتیں، وضع قطع، لباس، زبان وغیرہ دیکھ کر خوشی ہو تو ہو لیکن ایک غیر مسلم کو اس نظارہ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اسے تو دلچسپی اس وقت ہوگی اور وہ تو ہمدردی کے لئے اس وقت آمادہ ہوگا۔ جب وہ ان کے عزائم اور مقاصد اور اعمال میں کوئی ایسی حیات بخش اور جان پرور چیز دیکھے گا جو اسے دوسری جگہ کہیں نظر نہیں آتی۔ پاکستانیوں کے پاس کوئی پیغام غیر مسلموں کے لئے ضرور ہونا چاہیئے اور میرے خیال میں یہ چیز صرف غیر مسلموں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ خود مسلم عوام اور مسلمانوں کے سمجھدار طبقے پاکستان کے حصول کو اپنی زندگی کا مقصد صرف اسی صورت میں بنا سکیں گے جب وہ یہ یقین کرلیں گے کہ اس نصب العین کے اندر ان کے دلی رجحانات، ان کی خوابیدہ تمناؤں اور اعلیٰ ترین اخلاقی اور روحانی قدروں کی تسکین کا سامان موجود ہے۔ بڑی قربانیاں محض ذاتی مفاد اور تنگ نظر منافع کی خاطر نہیں کی جاتیں بلکہ وسیع تر انسانی بہبود کے لئے کی جاتی ہیں آدمی کے مجاہدانہ اور غازیانہ جذبہ کو خود غرضی کی اپیل کے ذریعہ نہیں ابھارا جا سکتا ہے اسے آمادہ عمل و ایثار کرنے کے لئے بنی نوع انسان کی خدمت و محبت، مظلوم اور بے کس طبقوں کی حمایت، اعلیٰ تر خیالات و مقاصد کی اشاعت وغیرہ سے کام لینا ہوتا ہے انہی چیزوں کے لئے لوگ جان و مال کی بڑی سے بڑی بازی لگا سکتے ہیں اور ایسے ہی جانبازوں کے خلوص کی مثال سنگدل دشمنوں کے دلوں کو پگھلانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی طریقہ ہے جس سے اپنے حریفوں کی مخالفتوں کو ہمیشہ کے لئے ختم اور فراموش کیا جا سکتا ہے

اور انھیں اپنے وفادار رفیقوں کے زمرہ میں شامل کیا جا سکتا ہے اور اسی طرح مملکت کے اندر اتحاد و ہم آہنگی، یگانگت اور یک دلی کو ترقی دی جا سکتی ہے اور اس کی مجموعی قوتوں کو تعمیر و تہذیب اور معیار زندگی کی بلندی کے کاموں میں لگایا جا سکتا ہے۔

اس نئے پاکستان کی کامیابی کی اولین شرط ایک ترقی پسند پروگرام ہے۔ اس کو غیر فرقہ وارانہ اور عادلانہ بنیاد پر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے وقت کے تقاضوں اور مطالبوں کا ساتھ دینا چاہیئے اور فرسودہ اور متروک نظا..ں یا نعروں سے حتی الوسع دور رہنا چاہیئے کیونکہ ہر چند یہ چیز ابتدا میں زیادہ آسان اور زود اثر معلوم ہوتی ہے لیکن بعد میں اس کی وجہ سے ایسے الجھاؤ اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں جن کے سلجھانے میں بہت قوت اور وقت ضائع ہو جاتا ہے۔

پروگرام بنانے کے بعد دوسرا کام یہ ہے کہ دلیر، ہوشمند اور صاحب نفوذ رہنماؤں کی ایک جماعت تیار کی جائے جس میں صرف وہ لوگ شامل کئے جائیں جو اپنا سب کچھ پارٹی کے لئے وقف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس پارٹی کو اپنے موجودہ موانع اور مواقع کا جذبات سے خالی ہوکر خالص علمی طریقہ سے جائزہ لینا چاہیئے اور اس جائزہ کی روشنی میں اپنے آئندہ کے کاموں کے بارے میں ایک مفصل نقشہ تیار کرنا چاہیئے اور یہ نقشہ محض وقتی اور ہنگامی نہ ہو بلکہ طویل مدت کی ضرورتوں اور مصلحتوں کو سامنے رکھ کر بنایا جائے۔ اس کے بعد اس کا سب سے اہم کام اپنے کارکن (کادر) تیار کرنا ہونا چاہیئے مسلمانوں میں اس وقت بڑا قحط الرجال پایا جاتا ہے دوسری قومیں ان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تعلیم یافتہ، دولت مند، منظم، بیدار اور باخبر ہیں شہری زندگی میں ان کا غلبہ ہے۔ سرکاری دفتروں اور تعلیم گاہوں پر وہ چھائے ہوتے ہیں۔ اخباروں پر ان کی حکومت ہے۔ بڑی تجارت، اعلیٰ صنعت اور اونچے ساہوکاری کی رہنمائی ان کے ہاتھ میں ہے اصلاح معاشرت کی تحریکیں ان میں خوب ترقی کر چکی ہیں پبلک کاموں کے لئے ان کے یہاں اوقاف بکثرت موجود ہیں اور ان کا نظام نہایت کامیابی اور ایمانداری سے چل رہا ہے۔ جدید

زمانہ کے ٹیکنیک سے ان کے نوجوان خوب واقف ہوتے جا رہے ہیں۔ سائنس، انجینیرنگ، میڈیسن کامرس، انڈسٹری، بنکنگ، ہوائی، بحری و بری فوج اور سول سروس کے اعلیٰ عہدوں میں ان کی نمائندگی بہت زیادہ ہے اس لئے ان کے یہاں کارکنوں کی کمی نہیں ہے لیکن مسلمانوں کی نمائندگی ان شعبوں میں بہت کم ہے اور جو لوگ ان میں کسی نہ کسی طرح پہنچ گئے ہیں ان میں آزادی، خود مختاری اور خود اعتمادی کا وہ جذبہ نہیں ہے جو ان کے برادرانِ وطن میں پایا جاتا ہے۔ وہ دوسروں کا سہارا ڈھونڈھنے پر مجبور نظر آتے ہیں اور ان کی خوشامد اور دلجوئی میں لگے رہتے ہیں، اقتدار کی جگہوں پر پہنچنے کے بعد یہ لوگ انفرادیت اور خود غرضی کے جذبہ کے ماتحت کام کرتے ہیں اور ان میں پبلک کی بے غرض خدمت کا ویسا جذبہ ابھی تک نہیں ہے جیسا کہ دوسروں میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے کوئی ترقی پسند پارٹی ان لوگوں پر زیادہ بھروسہ نہیں کر سکتی کیونکہ نہیں معلوم یہ لوگ کب اپنے حاکمانِ وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ غداری کر بیٹھیں اور اس کی تمام بے غرض خدمات اور قربانیوں کو اپنی نفسانیت اور ذاتی اغراض کی بھینٹ چڑھا دیں اسے تو اپنے لئے اہل، کارگذار اور لائق اعتماد کارکن خود تیار کرنا ہوں گے۔

کارکنوں کا حلقہ خاصا وسیع رکھنے کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگوں کو اصلاح معاشرت کی ان تحریکوں کی رہنمائی کے لئے جو مردوں اور عورتوں دونوں میں جاری ہیں تیار کرنا چاہیئے کچھ کو تجارت، صنعت، زراعت، بنک کاری کی رہنمائی کے لئے، کچھ کو سائنس اور انجینیرنگ کی مختلف شاخوں میں مہارت پیدا کرنے کے لئے ملک کے اندر اور غیر ملکوں میں بھیجنا چاہیئے، کچھ ماہر مزدوروں کی حیثیت سے تربیت پا کر مزدوروں کے درمیان رہنے اور کام کرنے کے لئے تیار کرنے چاہئیں کچھ کسانوں اور دیگر عوامی تحریکوں کی رہنمائی کے لئے تیار کئے جائیں۔ کچھ مجالس قانون ساز اور دیگر تعلیم یافتہ لوگوں اور تاجروں اور صناعوں کی انجمنوں کی رہنمائی کے لئے کچھ صحافت اور تصنیف تالیف کی رہنمائی کے لئے۔ کچھ غیر ملکوں کے لوگوں اور حکومتوں سے تعلقات پیدا کرنے اور انھیں خوشگوار رکھنے کے لئے۔ غرض اس پارٹی کے کاموں کو ہمہ گیر طریقہ پر تنظیم دینے

ی ضرورت ہے اور ہر کام میں انتہائی دوربینی اور مصلحت اندیشی ضروری ہے۔ پارٹی کے ہر رکن کو اپنے نصب العین کی بلندی اور اپنی ذمہ داری کی زبردست اہمیت کا پوری طرح احساس ہونا چاہیے اور ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مستعدی اور جفاکشی کے ساتھ کام کرتے رہنا چاہیئے۔

جب اس طرح کی پارٹی اور اس کے رکن تیار ہو جائیں گے اور اپنا کام تن دہی اور دیانت سے کرنا شروع کر دیں گے اور عوام کا اعتماد بلا امتیاز مسلم یا غیر مسلم حاصل کرنے لگیں گے تو پھر پاکستان کے اندرونی اور بیرونی مخالفوں میں ان کے مقابلہ کی ہمت اور طاقت باقی نہیں رہے گی، پاکستان کی صنعت، تجارت، بینک کاری، زراعت، سیاست تعلیم اور حکومت سب چیزوں کی رہنمائی اس پارٹی کے ہاتھ میں آجائے گی اور پاکستان ناگزیر ہو جائے گا۔

پاکستان عطا نہیں کیا جا سکتا۔ اسے صرف ایک ناگزیر حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جا سکتا ہے جس دن یہ ایک ناگزیر حقیقت ہو جائے گا اس وقت کسی کو اس کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

روسی سیاست خارجہ

موجودہ جنگ کے اختتام پر روس کی سیاست کی کیا شکل ہوگی یہ ایک ایسا سوال ہے جو اس وقت دوسری ریاستوں کے مدبرین کو ضرور پریشان کر رہا ہوگا۔ ویسے تو جن لوگوں کے ہاتھ میں ملکوں کی سیاست کی باگ ہوتی ہے وہ بہت دور کی سوچتے ہیں اور روسی ہوا جو دوسرے ممالک خاص کر برطانیہ کے سر پر عرصہ سے سوار تھا وہ روس کے جنگ میں شریک ہونے کے بعد بھی جوں کا توں رہا۔ مگر سب کا فائدہ اسی میں تھا کہ جرمنی کو شکست ہو اس لئے سب مل کر اب تک اس کوشش میں لگے رہے۔ اب کہ جرمنی کی شکست یقینی معلوم ہوتی ہے وہی "سرخ" خطرہ پھر قوموں کو پریشان کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روسی اژدہا بہت کچھ ہڑپ کر جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی دوسری عالمگیر جنگ ختم بھی نہیں ہونے پائی اور تیسری جنگ کا ذکر چھڑ لیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ جنگ میں برطانیہ نے اس وجہ سے حصہ لیا کہ یورپ پر ایک قوم مسلط ہوئی جا رہی تھی اور برطانیہ کا مفاد اسی میں ہے کہ یورپ کبھی ایک قوم کے زیر اثر نہ آنے پائے۔ ہٹلر کے خلاف برطانیہ نے اسی سبب سے جنگ کی جس سبب سے لوئیز چہاردہم اور نپولین اور قیصر ولیم کے خلاف کی تھی اب اگر موجودہ جنگ میں جرمن ہار بھی جائے تب بھی برطانیہ کے لئے تو وہی مسئلہ درپیش رہے گا۔ روس کے علاوہ یورپ کی ساری بڑی ریاستیں ختم ہو چکی ہوں گی اور اس صورت میں توازن دول کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ چاروں طرف روس ہی روس دکھائی دیتا ہوگا۔ اور یہ ہوا تو جرمنی کی ہار کے باوجود برطانیہ کی جیت نہ ہوگی جرمنی کا خطرہ تو برطانوی مقبوضات تک محدود تھا۔ روس کی طرف سے نہ صرف مقبوضات بلکہ خود برطانیہ کا سیاسی اور خاص طور پر معاشی نظام خطرہ میں پڑ جائے گا۔

اس مضمون میں بالشویکی روس کے ماضی کو پیش نظر رکھ کر یہ اندازہ کرنے کی کوشش کی گئی ہو کہ یہ خطرہ کہاں تک حق بجانب ہے۔

روس کی سیاست خارجہ انہیں اصولوں پر مبنی ہے جن پر دوسری ریاستوں کی سیاست کا دارومدار ہوتا ہے۔ جب تک دنیا میں ریاستوں کا وجود طاقت پر موقوف ہے اس وقت تک ناممکن ہے کہ روس اس سے بے نیاز ہو جو قومیں خود طاقتور ہوتی ہیں اور سیاست کے اس کھیل سے اچھی طرح واقف ہوتی ہیں جو طاقت کی مدد سے کھیلا جاتا ہے وہ دنیا میں کامیاب ہوتی ہیں اور جو اس کھیل کا کھیلنا نہیں جانتیں۔ انہیں نیچا دیکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ہر قوم اسی فکر میں رہتی ہے کہ اس کی اپنی طاقت میں اضافہ ہو اور دشمنوں کی طاقت میں کمی۔ قوموں کی باہمی دوستی یا دشمنی مستقل چیز نہیں ہوتی۔ اس لئے آج کے دوستوں کو بھی کل کے دشمنوں میں شمار کرنا پڑتا ہے۔ بہترین صورت تو یہی ہے کہ دنیا میں کوئی بھی مدمقابل باقی نہ رہے مگر یہ آسان نہیں جو چیز ممکن ہے وہ یہ ہو کہ اپنے لئے دوست پیدا کئے جائیں اور جو ممکن دشمن ہیں انھیں جہاں تک ہو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا جائے اور ان کو متحد نہ ہونے دیا جائے یہ مقاصد توازن دول کے اصول سے حاصل کئے جا سکتے ہیں یعنی یہ کہ تمام ممکن دشمن آپس میں متحد نہ ہونے دئے جائیں اور جب ان میں جنگ ہوتا چلے تو کمزور کا ساتھ دیا جائے تاکہ ان میں سے کسی کی بھی طاقت کو غیر معمولی فروغ نہ ہونے پائے۔ اگر بجائے کمزور کے طاقتور کا ساتھ دیا تو اس غلطی کا خمیازہ اٹھانا ناگزیر ہے پس ممکن نہیں کہ بالشویکی روس جس کی شرکت اس جنگ میں فیصلہ کن ثابت ہوئی ہے اپنی طاقت کو بڑھانے اور اپنے ممکن دشمنوں کی طاقت کو گھٹانے کی فکر نہ کرے۔ یہ بات اور ہے کہ طاقت کس طرح بڑھائی جائے گی اور دشمنوں سے خطرہ کو کس طرح کم کیا جائے گا

روس کی تاریخ کے چند اہم واقعات کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ ان واقعات کو جانے بغیر روس کی حکمت عملی کو سمجھنا ممکن نہیں بالشویکی روس کا پہلا

بڑا تجربہ تھا، جرمنی کے ہاتھوں شکست ۱۹۱۷ء۔ اور باوجود اس کے کہ برطانیہ، امریکہ، جاپان، فرانس، اٹلی اور ان گنت چھوٹی چھوٹی ریاستیں جرمنی کے خلاف جنگ کر رہی تھیں، پھر روس کا قوموں میں اچھوت قرار دیا جانا۔ روس کی ناکہ بندی، اس کے ہاں دوسری قوموں کی دخل اندازی اور اس کے پرانے ساتھیوں کے حملے۔

(۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء) پولینڈ کی فوجوں کی چڑھائی (۱۹۲۰ء)، روس کی طرف سے مغرب و مشرق میں انقلاب کرانے کی ناکام کوششیں۔ شکست خوردہ اقوام خصوصاً جرمنی کے ساتھ دوستی جس نے ۱۹۲۲ء میں رپالو کے معاہدہ کی صورت اختیار کی۔ پھر کچھ عرصہ کی بے فکری کے بعد جرمنی میں نازی جماعت کا برسرکار آنا، اور روس کا جمہوری ممالک کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا، جمعیت اقوام کی کارکن بننا، اور جمعیت کے ذریعہ اور جمہوری ممالک کی مدد سے نازی خطرہ کی روک تھام کرنا ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۸ء۔ مگر اس خطرہ کا بڑھتا جانا اور جب ۱۹۳۹ء میں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ روس بالکل اکیلا رہ گیا ہے روسی حکمت عملی کا ایک عجب پلٹا کھانا اور جرمنی سے معاہدہ کر کے نصف پولینڈ اور بالٹک ممالک پر قبضہ جمانا، نیز فن لینڈ اور رومانیہ سے بعض اہم علاقے حاصل کرنا۔ جرمنی سے معاہدہ کی وجہ یقیناً یہ تھی کہ روس نے جرمنی کو جمہوری ممالک کے مقابلہ میں کمزور سمجھا (یہ اندازہ واقعات، خصوصاً فرانس کے ہتھیار ڈالنے سے سراسر غلط ثابت ہوا) پھر ۱۹۴۱ء میں جرمنی کا روس پر حملہ آور ہونا اور ابتدائی شکستوں کے بعد برطانیہ اور امریکہ کی مدد سے جرمنی کو نیچا دکھانا۔ یہ سب واقعات گذشتہ چوتھائی صدی کے دوران میں روس کی سیاست کی تشکیل کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔

روس بالٹکی ممالک، نصف پولینڈ، اور فن لینڈ اور رومانیا کے بعض حصوں پر قبضہ کرنے کی ضرور کوشش کرے گا (یہ مقاصد جرمنی سے جنگ چھڑنے سے پہلے وہ حاصل کر چکا تھا)۔ پھر روس اس پر بھی اصرار کرے گا کہ فن لینڈ، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ، بلغاریہ، ہنگری، رومانیہ اور ترکی میں ایسی حکومتیں قائم ہوں جو روس کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھیں

روس کے مخالفین سے نہ جا ملیں۔ ایران کے ایک حصہ میں روس ضرور اپنا اثر قائم کرنا چاہے گا جرمنی سے متعلق روس کی حکمت عملی یہ ہوگی کہ نازی نظام حکومت کا خاتمہ کیا جائے ۔ اس کی جگہ کوئی جمہوری حکومت قائم کی جائے جس سے جنگ کا پھر خطرہ نہ ہو۔ روس اس بات کو کبھی گوارہ نہیں کرے گا کہ یورپ کی قومیں روس کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں. مختصراً روس کے بس یہ مقاصد معلوم ہوتے ہیں۔ اگر یہ حاصل ہوگئے تو نہ صرف روس کی اپنی طاقت میں اضافہ ہوجائے گا بلکہ اس کے تمام ممکن دشمن کمزور پڑجائیں گے اور جو خاص طور پر کمزور نہیں بھی پڑیں گے (مثلاً برطانیہ)، تو کم ازکم روس کے قریبی علاقوں میں ان کی ریشہ دوانیوں کا خدشہ باقی نہ رہے گا ، بلقان، ایران اور پولینڈ سے روس کے خلاف وہ فائدہ نہ اٹھاسکیں گے۔ روس کی جیت اس جنگ میں اسی وقت ہوگی جب یہ مقاصد حاصل ہوں ورنہ روس جس کے نقصانات دوسرے اتحادیوں کے مشترکہ نقصان سے دس گنے ہیں کیسے خاموش بیٹھے گا۔ روس کے لئے تو جنگ اسی وقت ختم ہوجائے گی جب یہ تمام مقاصد پورے ہو جائیں گے کہ اسی صورت میں روس چین کی نیند سو سکے گا۔

روس یہ حماقت نہ کرے گا کہ ساری دنیا پر اپنا سکہ جمانے کی کوشش کرے ۔ تاریخ میں ایسی جتنی کوششیں ہوئیں وہ آخر میں ناکام رہیں یہ طریقہ تمام اقوام کی دشمنی مول لینے کا ہے اور اسی وجہ سے نقصان دہ ہے روس ساری دنیا میں انقلاب کرانے کا بھی ٹھیکیدار نہیں ہے۔ انقلابی پالیسی جو ایک عرصہ سے پھیکی پڑ چکی تھی ۱۹۳۵ء میں بالکل رد کردی گئی۔ اور کومنٹرن ۱۹۴۳ء میں دفن کردیا گیا روس میں آج نہ ٹراٹسکی ہے، نہ زینو نیف ۔ اور یہ خیال کہ روس دوسرے ممالک میں بزور شمشیر یا بذریعہ تبلیغ اشتراکی تحریک پھیلائے گا صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔ سوائے ان علاقوں کے جنہیں روس اپنے میں شامل کرنا چاہتا ہے وہ مفتوحہ علاقوں میں کہیں بھی اشتراکی حکومتیں قائم کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے اور غالباً آئندہ بھی نہیں کرے گا۔ چھوٹے ممالک مثلاً ہنگری رومانیہ وغیرہ میں غیر اشتراکی حکومتیں ہوں گی تو ان سے تاوان وصول کرنا زیادہ سہل ہوگا ۔ اور جرمنی میں تو جمہوری حکومت روس کے لئے خاص طور پر موزوں ہوگی نہ صرف تاوان وصول کرنے کی غرض سے بلکہ اس لئے

بھی کہ اگر جرمنی اشتراکی ہوگیا تو اشتراکی دنیا کی قیادت روس سے چھن جانے کا خوف ہوگا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ روس دوسرے ممالک کی اشتراکی جماعتوں سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ دوسرے ملکوں کی اشتراکی جماعتیں ضرور روس کی قیادت تسلیم کرتی رہیں گی اور اس کی طاقت سے فائدہ اٹھاتی رہیں گی۔ اور روس بھی اپنی خارجی حکمت عملی میں ان سے مستفید ہوتا رہے گا جہاں پر اپنا کام نکالنا یا غیر ممالک کی حکومتوں پر زور ڈالنا ہوگا وہاں یہ جماعتیں روس کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گی۔

یہ بھی قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ روس جمعیت اقوام یا اسی قسم کی کسی دوسری جماعت کے ذریعہ دنیا میں امن وامان قائم کرنے کی کوشش کرے گا۔ روس کا تجربہ بہت ہی بُرا ہے جمعیت اقوام میں شریک ہوکر اور مغربی ریاستوں سے مل کر روس نے کچھ میٹھا پھل نہ پایا اور جمعیت اقوام سے تو دسمبر ۱۹۳۹ء میں وہ بڑی بے عزتی کے ساتھ نکالا جاچکا ہے اسے یہ بھی معلوم ہے کہ برطانیہ اور فرانس روس کو جرمنی کے خلاف کسی قسم کی مدد دینے پر آمادہ نہ تھے اور پولینڈ اور بالٹکی ریاستوں کے لئے جرمنی کے خوف کے باوجود روس کی امداد لینے پر راضی نہ تھے!

اب اگر روس تمام دنیا پر چھا بھی نہیں سکتا اور بین الاقوامی اداروں پر بھی اس کا کچھ بہت اعتماد نہیں ہے تو روس جنگ کے بعد اپنی حفاظت کی کیا تدبیریں اختیار کرے گا۔ اس سوال کا جواب دو طرح پر ممکن ہے یا تو برطانیہ اور امریکہ۔ خاص طور پر برطانیہ بالٹکی ممالک بلقان اور ایران کے ایک حصہ میں روس کی برتری تسلیم کرلیں گے یا اس برتری کو نہ مانیں گے اگر یہ برتری مان لی گئی جیسا کہ چرچل اور اسٹالن کی حال کی گفت وشنید سے شبہہ ہوتا ہے تو روس کے تعلقات اپنے موجودہ ساتھیوں کے ساتھ اچھے رہیں گے۔ اور اگر ان میں سے ایک سے بگڑے گی بھی تو دوسرے سے روس فائدہ اٹھا سکے گا۔ برطانیہ سے بگاڑ کا زیادہ امکان ہے۔ مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ میں روس اور برطانیہ کے مفاد کا ٹکرانا نہ صرف ممکن بلکہ قرین قیاس ہے برخلاف اس کے امریکہ سے تعلقات اچھے رکھے جاسکتے ہیں۔ جنگ کے بعد خصوصاً ان ہولناکیوں کے بعد جن کا روس شکار رہا ہے اسے اپنے آپ کو دوبارہ بنانا ہے اور اس سلسلہ میں بیرونی امداد کے بغیر کام نہ چلے گا۔ روس کی صنعتی ترقی کے لئے امریکہ سے زیادہ کون کام آسکتا ہے

امریکہ کو بھی نئے بازاروں کی ضرورت ہوگی۔ روس سے کہیں اُن کا مفاد نہیں ٹکراتا۔ اور دونوں ایک دوسرے کے لئے بہت مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ روس کی مدد سے امریکہ برطانیہ کا بھی بہتر مقابلہ کرسکے گا۔ اور امریکی سیاست تو اس وقت اسی خیال پر مبنی معلوم ہوتی ہے کہ آیندہ امریکہ کی حیثیت دنیا میں وہ ہو جو برطانیہ کی یورپ میں تھی۔ وہی توازن دول ہو اور وہی اپنی فیصلہ کن حیثیت۔ جو خواب امریکہ دیکھ رہا ہے وہی روس کا خواب معلوم ہوتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جنگ کے بعد امریکہ اور برطانیہ میں کامل اتحاد باقی رہے۔ اور دونوں مل کر روس کی مخالفت پر کمر باندھیں سلاوی یورپ میں اس کی برتری سے انکار کریں اور بلقان وغیرہ میں ریشہ دوانیاں کرتے رہیں۔ یہ ہوا تو روس کو پھر وہی پالیسی اختیار کرنا پڑے گی جو اس نے پچھلی جنگ کے بعد کی تھی۔ یعنی شکست خوردہ اقوام کے ساتھ دوستی پیدا کرنا۔ جرمنی اور اٹلی اور فرانس اور جاپان سب ہی کے ساتھ میل ملاپ کرنا ہوگا۔ اور نہ صرف میل کرنا ہوگا بلکہ اُن کی طاقت بھی ایک حد تک بڑھانا ہوگی۔ چونکہ موجودہ ساتھیوں سے جنگ کے بعد بگاڑ ہو جانے کا امکان بھی روس کے پیش نظر ہے۔ اسی وجہ سے روس نے کبھی بھی اپنے آپ کو جرمن قوم کا دشمن نہیں بتایا۔ اور نہ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے پر اصرار کیا۔ اِدھر جاپان سے بھی باوجود اتحادیوں کی پیہم کوششوں کے جنگ نہ چھیڑی۔ نازیوں کو تباہ کرکے روس جرمنی کو تباہی سے بچانے کی تدابیر کرے گا۔ مگر یہ ایسی صورت میں جب برطانیہ اور امریکہ سے سمجھوتہ کی تمام کوششیں ناکام ہوں اس لئے کہ جرمنی پھر بہت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ اور جہاں تک ممکن ہوگا روس ۱۹۳۹ء والا جوا پھر آسانی سے نہ کھیلے گا۔

آشرم

صبح کو جیسے ہی اتنی روشنی ہو جاتی کہ چیزیں دکھائی دینے لگیں، لکشمی بائی اُٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔ اُٹھ کر مُنہ ہاتھ دھوتیں، پھر اپنے یہاں چولھا جلانے اور ناشتہ پکانے کا سامان کر کے وہ گرو جی کے جھونپڑے پر جاتیں، اس کے سامنے جھاڑو دیتیں، پرارتھنا کے لئے چٹائی کے اس بچھاتیں اور پھر آشرم کے باورچی خانے میں مشغول ہو جاتیں۔ اُٹھنے اور پرارتھنا کے لئے جمع ہونے کا گھنٹا کوئی اور بجاتا تھا، اس کام میں عزت اور اختیار کی جھلک تھی اور لکشمی بائی صرف ادنےٰ کام کرنا چاہتی تھیں۔ آشرم میں پورا بھائی چارہ تھا، وہاں کے سب آدمی ایک سے، سب کام ایک سے سمجھے جاتے تھے، لیکن لکشمی بائی بیوہ تھیں، اُن کے نزدیک گمنام رہنا ہی اُن کے لئے مناسب تھا آشرم میں اُن کے لڑکے رام گوپال کی پرورش ہو رہی تھی، اور اُن کے دل پر اس احساس کا بھی بوجھ تھا۔ اُنھوں نے خاکساری کا ایک ایسا گھونگھٹ نکالا تھا کہ اُن کی اپنی کوئی شکل رہی تھی نہ شخصیت نہ خیالات تھے نہ زبان۔ انھیں بس اپنے حقیر کاموں سے مطلب تھا اور اپنے لڑکے رام گوپال سے آشرم میں اُنھیں رہتے دس سال ہو گئے تھے، اور اب انھوں نے وقت کا حساب رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اُن کے لئے یہ کافی تھا کہ رام گوپال پندرہ سال کا ہو گیا ہے، کچھ پڑھ لکھ گیا ہے، کچھ کام سیکھ گیا ہے، اور لوگ اس سے خوش ہیں۔ اس پر لکشمی بائی نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ آشرم کیوں قائم ہوا اور وہ دھرم یا ملک کی کیا سیوا کر رہا ہے۔ ان کا دل یہ کہتا تھا کہ آشرم آباد رہے گا، رام گوپال بڑا ہوگا تو اُسے کوئی نہ کوئی کام مل جائے گا۔ اور اُس کے دن اطمینان سے کٹ جائیں گے۔ آشرم میں لڑکیاں بھی تھیں، بیاہ بھی ہوا کرتے تھے، بیوی بچے والوں کو کچھ بڑے جھونپڑے مل جاتے تھے کام کی تقسیم میں اس کا خیال رکھا جاتا تھا کہ انھیں گھر کی خبر لینے کی مہلت مل جائے۔ لکشمی بائی کو اس وجہ سے اور بھی یک سوئی ہو گئی تھی کہ رام گوپال کے دل میں کوئی خاص حوصلہ نظر نہیں آتا تھا

وہ پڑھنے میں اچھا تھا نہ بُرا، دوسرے کام شوق سے کرتا تھا نہ بے پروائی سے۔ آشرم کے مدرسے کے اُستاد شیام سُندر جی کہتے تھے کہ اگر یہ کسی سوچ میں نہ پڑ جائے اور اپنے کام پر پورا دھیان دے تو بہت سے دوسروں سے کچھ بہتر ہی کر سکتا ہے، وہ کبھی اسے سوئے سوئے رہنے پر ٹوکتے تھے۔ مگر اُن کی تنبیہہ کا اس پر اتنی جلدی اثر ہوتا کہ وہ اس کے عیب کو بھول جاتے۔ لکشمی بائی کی ہم عمر عورتیں رام گوپال کو دیکھ کر اکثر پوچھتی تھیں کہ یہ اتنا دُبلا کیوں ہے، اس کی آنکھوں کے گرد حلقے کیوں ہیں، گال پچکے کیوں ہیں، وہ اتنا جھینپا کیوں ہے۔ لیکن رام گوپال کچھ زیادہ بیمار نہیں رہتا تھا، بس اس کی خوراک کم تھی اور لکشمی بائی یہی کہہ کر ٹال دیتیں کہ وہ کھاتا کچھ نہیں۔ آشرم کی لڑکیاں رام گوپال کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ انھیں یہ بُرا لگتا تھا کہ وہ بولتا بہت کم ہے، جب وہ اس سے بات کرتی ہیں تو وہ اپنی نظریں چھپاتا ہے اور وہ کسی اور سے مخاطب ہوتی ہیں یا اپنے کاموں میں لگی ہوتی ہیں تو انھیں اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے تکتا رہتا ہے۔ وہ کسی لڑکی سے ہنس کر بات نہ کرتا، دوسرے آپس میں مذاق کرتے تو وہ شرما کر سر جھکا لیتا، یا اتنی زور سے ہنستا کہ سب اسے دیکھنے لگتے، اور تب وہ اور شرماتا جاتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رام گوپال سے کسی لڑکی کو شکایت ہوئی ہو۔ بس سب نے سمجھ لیا تھا کہ اس میں وہ شگفتگی اور کشش نہیں ہے جو ہر نوجوان میں ہونا چاہیے، اور وہ اس کی طرف بہت کم متوجہ ہوتیں۔ رام گوپال کو اکثر اس کا احساس ہوتا اور تھوڑی دیر کے لئے اس کی جھینپ بہت بڑھ جاتی۔

ایسے موقعوں پر رام گوپال آئینے میں اپنی صورت ذرا زیادہ غور سے دیکھتا۔ اس کا رنگ دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں صاف تھا، پیشانی چوڑی، ناک ستواں، ہونٹ پتلے۔ اس کے چہرے پر ایک اعصابی لرزہ سا رہتا، چہرے کی رنگت ایک حالت پر قائم نہ رہتی، باچھیں سمٹتی اور پھیلتی رہتیں۔ یہ کیفیت اسے بھلی لگتی تھی، اور اُسے تعجب ہوتا کہ دوسرے لڑکے جن کی صورت بیشتر ایک سی رہتی تھی اپنے اس عیب کو محسوس نہیں کرتے، لڑکیاں ان کی اس خامی پر ناخوش نہیں ہوتیں۔ آئینہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ رام گوپال دیکھ سکے کہ قد کے لحاظ سے اس کا سر بہت چھوٹا ہے، سینہ تنگ اور ٹانگیں بھاری ہیں۔ آشرم کے لڑکوں اور مردوں کی طرح رام گوپال بھی سال میں آٹھ نو مہینے خالی ایک دھوتی باندھے رہتا تھا، اور اکثر جب وہ اپنی باہوں اور سینے کو دیکھتا تو اس کے دل میں گدگدی، پیٹ میں خوش گوار ہیجان سا اُٹھتا۔ اُسے یقین تھا کہ اس کے بدن میں جو بات ہے وہ کسی دوسرے کے بدن میں نہیں اور وہ خیال

میں اپنے آپ کو پیار کرنے لگتا۔ خیال کی دنیا میں وہ بڑا ہی آزاد تھا۔ یہاں روزمرہ زندگی کی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ یہاں وہ جو چاہتا ہو جاتا تھا۔ اور وہ چاہتا یہ تھا کہ اپنی شخصیت کو کبھی کسی، کبھی کسی خوبی کا مجسمہ بنائے اور اس کی زندگی اُس کے کرشموں کی ایک داستان ہو جائے جیسے کہانیوں کی کتاب میں کبھی ایک، کبھی دوسری کہانی پڑھی جاسکتی ہے، ویسے ہی رام گوپال اپنے آپ کو کبھی کسی کبھی کسی روپ میں دیکھتا، اور اپنے ہر روپ کو مناسب داستان سے آراستہ کرتا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی خود پسند عورت کسی تقریب میں سنور کر جانا چاہتی ہے تو اپنے کپڑے نکال کر رکھتی ہے۔ بہتیرے پہن کر دیکھتی ہے، سنگھار دان سے زیور چن چن کر رنگ اور چمک ملاتی ہے، سب کو پسند کرتی ہے اور کسی سے مطمئن نہیں ہوتی۔ رام گوپال کی خیالی داستانوں میں سے ایک تھی جس میں وہ گویے کے روپ میں ہوتا، اور جی میں آتا تو اس طرح گاتا کہ سننے والے مست ہو جاتے۔ لڑکے لڑکیاں، مرد، عورتیں سب جھومنے لگتے، ایسا نشہ برسنے لگتا کہ جھجک، تکلف، لباس رنگ کی طرح اُڑ جاتا۔ ایک اور داستان تھی جس میں وہ سورما بنتا تھا، بلا کا حسین اور نازک مزاج، مرد اُس سے نظریں نیچی کرکے بات کرتے، لڑکیاں گڑگڑا کر، لڑکے سب اس سے جلتے، مگر اس کا اعلیٰ ظرف اُنھیں شرمندہ اور خاموش رکھتا۔ یہ داستانیں آشرم کی فضا کا عکس تھیں۔ آشرم میں پریم اور دھیان کا چرچا رہتا تھا۔ اس لئے رام گوپال اپنی خیالی دنیا میں زیادہ تر اپنے آپ کو پریمی کے روپ میں دیکھتا تھا۔ اس پر پریمی کی کیفیت اکثر پرارتھنا کے دوران میں مگر کبھی کام کرتے کرتے بھی طاری ہو جاتی، اس کا دل خوشی سے ناچنے لگتا، آنکھیں ڈبڈبانے لگتیں، منہ بدمستی کی سی مسکراہٹ سے پھیل جاتا۔ دیکھنے والے کو اس کی اس حالت پر اچنبھا ہوتا، مگر یہ تو رام گوپال ہی کو معلوم تھا اور وہ کسی کو بتاتا کیسے؟ کہ وہ رشیوں منیوں اور اوتاروں کی محفل میں اور اُن کے برابر بیٹھا کرتا ہے۔ اسے ایشور کے درشن ملتے رہتے ہیں، جیسے ایک گھر میں رہنے والے باپ بیٹے کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ ساری جنتا کو پریم کا دیوانہ کر دیتا ہے اور نوجوان بھگتیں اس سے کہتی ہیں کہ تجھ سے بہتر کون ہو سکتا ہے تو نے تو ہم کو پریم کا امرت پلا دیا۔ جب یہ کیفیت گذر جاتی تو رام گوپال کو اپنی جسارت اپنے تخیل کی بیباکی پر حیرت ہوتی۔ کبھی وہ اپنے آپ کو ملامت بھی کرتا۔ لیکن اس کا دل ایسی کیفیتوں کو پھر طاری کرنے کا خواہش مند رہتا۔ جیسے شرابی کی بدمستی کی حرکتوں پر نادم ہونے کے بعد بھی نشے کی طلب رہتی ہے۔ اس کو زندگی کا مزہ انھیں کیفیتوں میں ملتا تھا۔ روزمرہ کے کاموں سے بھاگ کر وہ انھیں میں پناہ لیتا۔ اپنی

اس عادت کی وجہ سے وہ سمجھنے لگا کہ لوگ اس کی اصلیت سے واقف نہیں، ان میں وہ ایک اجنبی سا ہے اور عمر بھر رہے گا۔ دل کی دنیا میں جتنا وہ بے تکلف تھا اتنا ہی وہ ظاہری دنیا میں شرمیلا اور بودا ہوتا گیا۔

اسی وجہ سے رام گوپال کو کبھی آشرم چھوڑنے کی خواہش نہیں ہوئی۔ آشرم سے لوگ شہر جایا کرتے تھے، شہر کے لوگ کبھی سیر کرنے کبھی گروجی کے درشن کے لئے آشرم آتے۔ رام گوپال نے بازار کی چہل پہل اور ضرورت اور آسائش کا وہ سامان جو بڑی دکانوں میں سجا سجایا دکھا تھا، وہ ریل کا سفر کر چکا تھا، موٹر پر بھی بیٹھا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ چیزیں اچھی ہیں، موٹر پر جو مزہ آیا تھا وہ اسے ہفتوں یاد رہا لیکن لکشمی بائی کی تربیت اور آشرم کی فضا نے یہ خیال اس کے دل نشیں کر دیا تھا کہ بہترین زندگی آشرم کی ہے، اور آشرم میں جن لوگوں کی رائے سب سے زیادہ صحیح مانی جاتی تھی وہ دنیا کے دھندوں کو حقیر اور عیش کی زندگی کو ادنے کہتے تھے۔ رام گوپال اپنی خیالی دنیا میں بھی دولت کو ٹھکراتا رہتا، اور جب کبھی وہ اپنے کسی روپ میں روحانیت کے جوش میں یا خالی اپنے دل کی بڑائی دکھلانے کے لئے دنیا کو تجنے کا ارادہ کرتا تو اسے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ حقیقی دنیا میں وہ ایک غریب بیوہ کا لڑکا سہی، خیال میں وہ فنون لطیفہ کا ماہر سورما، رشی سبھی کچھ بن چکا تھا، شہرت اور عظمت اور دلوں کی حکومت حاصل کر کے چھوڑ چکا تھا۔ وہ آشرم میں کسی موٹر کو کھڑا دیکھتا تو گاؤں کے لڑکوں کی طرح دوڑ کر اس کے پاس نہ جاتا، دولت مند لوگ گروجی سے ملنے آتے تو وہ بہت مرعوب نہ ہوتا۔ اس کے تخیل نے مادی زندگی کی حدبندیوں کو کچھ اس طرح توڑ دیا تھا، مجبوریوں کو جادو کی پھونک سے اس طرح دور کر دیا تھا کہ رام گوپال کو کسی چیز کی خاص ہوس نہ تھی اور اپنے تخیل کی تخلیقی قوت پر بھروسا کر کے اکثر نعمتوں کو وہ کہہ سکتا تھا کہ اسے درکار نہیں ہیں۔

اس لئے جب آشرم میں اس بات کا چرچا ہوا کہ سیٹھ ہنس راج اپنے لڑکے گردیال کو آشرم میں رہنے کے لئے بھیجیں گے تو رام گوپال بالکل متاثر نہیں ہوا۔ اسے یہ برا لگا کہ لڑکیاں معمول سے کچھ زیادہ کانا پھوسی کرنے لگیں۔ دوسروں کی باتوں سے اس کو معلوم ہوا کہ گردیال بی اے پاس کر چکا ہے، رنگین مزاج ہے، باپ کا کہنا نہیں مانتا۔ اور سیٹھ ہنس راج اسے آشرم اس امید میں بھیج رہے ہیں کہ گروجی کی صحبت میں رہ کر اور ان کی نصیحتیں سن کر وہ اپنا طریقہ بدل دے گا۔ اس کا بھی رام گوپال پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لیکن اتفاق سے اس سہ پہر کو جب گردیال موٹر پر آشرم پہنچا تو رام گوپال پھاٹک کے پاس کیاریوں میں نرائی کر رہا تھا۔ گردیال نے

نے سب سے پہلے اسی کو دیکھا اور موٹر سے اُتر کر پکارا۔

"ارے بھئی ذرا یہاں آکر میری مدد کردو گے!"

رام گوپال ہاتھ میں کھرپا لئے اس کی طرف چلا۔ اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی موٹر کے پاس ایک خاصا قدآور جوان کھڑا مسکراتا ہوا اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔ اس کے منہ میں سگرٹ دبا ہے اور اس کے دھوئیں سے بچانے کے لئے وہ ایک آنکھ بند کئے ہے۔ رام گوپال پاس پہنچا تو اُس نے کہا۔

"بھیا معاف کرنا میں نے تم کو کام سے اُٹھا دیا۔ میں اسباب زیادہ نہیں لایا ہوں مگر بستر ذرا بھاری ہے۔ پتاجی سے وعدہ کر آیا ہوں کہ ایک ہفتے تک آشرم کے باہر نہ جاؤں گا، اس لئے میں کتابیں ساتھ لے آیا ہوں۔ نہیں تو یہاں وقت کیسے کٹے گا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ جاؤں کدھر۔"

یہ کہتے کہتے گردیال موٹر کی پچھلی سیٹ کی طرف جھک گیا اور زادہنہ" کرکے اپنا بستر اس میں سے نکالا اور ایک چھوٹا سا بکس۔ رام گوپال نے کھرپا الگ رکھ کر بستر کو ایک طرف سے پکڑ لیا تھا، گردیال نے بستر کو چھوڑ دیا اور بناوٹی گھبراہٹ سے پوچھا۔

"مگر بھئی یہ تو بتادو، تم کہیں آشرم کے گروجی تو نہیں ہو؟"

رام گوپال نے مسکرا کر کہا، "جی نہیں۔"

"خیر، میرے پاپ دیسے کون کم ہیں، اس پر آشرم کے گروجی سے اسباب اُٹھواؤں تو پورا راون بن جاؤں گا۔ اور پھر ہفتے بھر کے بن باس سے میرا کچھ بھلا نہ ہوگا۔ اچھا تو بتاؤ کدھر چلیں۔"

رام گوپال کو معلوم تھا کہ آشرم کے مہمان کس جھونپڑے میں ٹھہرائے جاتے ہیں۔ اس نے ہاتھ سے اسی طرف اشارہ کیا اور دونوں پہلے کی طرح اسباب اُٹھا کر اُسی طرف چلے۔ جھونپڑی میں پہنچ کر انھوں نے اسباب رکھ دیا۔ گردیال نے ہانپتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"تو یہ ہے کلجگ میں سورگ کا نمونہ؟ اچھا، یہی سہی، اب بھئی برہمچاری، ایک ذرا سا کام اور کردو۔"

یہ کہہ کر گردیال جھونپڑے سے نکلا اور پھاٹک کی طرف چلا۔ چلتے چلتے اُس نے کہا،

"تو برہمچاری، تم سچ مچ آشرم کے گروجی نہیں ہو؟"

رام گوپال جواب دینے کے بجائے صرف مسکرا دیا۔

"گردجی نہ ہو تو بھارشی تو ضرور ہوگے۔ تمھاری شانتی بڑے غضب کی ہے منہ سے بات نہیں کرتے"

رام گوپال کچھ جھینپا، کچھ خوش ہوا۔ آشرم میں ابھی تک کسی نے اس سے اس انداز میں گفتگو نہیں کی تھی، نہ کوئی ایسا ہنس مکھ تھا۔ گردیال کی صورت بھی اُسے پسند آئی تھی۔ خاص طور سے یہ بات کہ اس کا سگریٹ اس کے منہ کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ سگریٹ کا دھواں اس کے منہ کے سامنے چھایا رہتا۔ اس کی ایک آنکھ بند اور ہونٹ ایک طرف کو اُٹھے رہتے۔ معلوم ہوتا تھا اُسے کوئی دکھ ہے جسے وہ مذاق میں ٹالنا چاہتا ہے۔ آشرم میں کسی مرد کے بال نہ اتنے لمبے تھے، نہ اس طرح بکھرے رہتے، کسی کی بالوں میں ایسی شوخی تھی نہ آنکھوں میں ایسی ہمدردی۔

گردیال نے موٹر کے پاس پہنچ کر کاروباری لہجے میں کہا،

"مہارشی، پہلے یہ بتاؤ کہ اس موٹر کو کہیں چھپر کا سایہ مل سکتا ہے تو اُسے وہاں لے چلو نہیں تو تمھارے کرموں میں لکھا جائے گا کہ تم نے اس کی ہتیا کی"

رام گوپال نے کچھ سوچ کر کہا،

"جی ہاں، ایک چھپر تو ہے، مگر وہاں تک سڑک نہیں ہے"

"تو پھر جانے دو۔ اسے یہیں کپڑا اُڑھا کر چھوڑ دیں گے"

گردیال نے موٹر میں سے کپڑا نکالا اور رام گوپال کی مدد سے موٹر کو ڈھک دیا۔

"اچھا چلو، اب گردجی اجازت دیں تو ان کے چرن چھولوں، پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے"

رام گوپال اسے گردجی کے پاس لے جانا چاہتا تھا کہ راستے میں بھائی شری پرکاش مل گئے گردیال نے انھیں بڑی متانت سے سلام کیا اور کہا:

"میں گردیال ہوں۔ اپنے پتاجی سیٹھ ہنس راج کے حکم سے آپ کی سیوا میں حاضر ہوا ہوں"

"جی جی، جی ہاں، آئیے۔ آپ نے اپنا سامان کہاں رکھا ہے۔ آپ تو بہت کچھ ساتھ لائے ہوں گے"

رام گوپال نے محسوس کیا کہ شری پرکاش جی کی آواز میں طنز ہے اور چہرے پر ایک مسکراہٹ جو معلوم

ہوتا تھا۔ گرودیال کے بکوٹے دے رہی ہے۔ اس نے کچھ گھبرا کر گرودیال کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ بھی مسکرا رہا تھا۔

سامان تو بہت کچھ ساتھ لایا ہوں، مگر وہ سب میرے پاپ ہیں۔ اُن کو تو آپ یہاں رکھنا نہ چاہیں گے۔ ویسے ایک بستر اور ہینڈ بیگ ہے۔ وہ ان مہارشی کی مدد سے میں نے پکڑا کر جہاں انھوں نے بتایا وہاں رکھ دیا ہو۔"

"اچھا۔ گروجی آپ کو پوچھ رہے تھے۔ لیکن اُن کے ملنے کا وقت پرارتھنا کے بعد ہے۔"

"کوئی حرج نہیں۔ میں اُسی وقت اُن سے مل لوں گا۔ آپ بھی اپنا وقت ضائع نہ کیجئے۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو اُن مہارشی سے کہدوں گا۔"

"اچھا، رام گوپال، تم گرودیال جی کے ساتھ رہو" یہ کہہ کر شری کرشن جی آگے بڑھ گئے۔ گرودیال نے رام گوپال کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور پھر دونوں مہمانوں کی جھونپڑی میں چلے گئے۔ وہاں گرودیال نے پلنگ پر اپنا بستر بچھایا اور اس میں جو پندرہ بیس کتابیں تھیں انھیں اُٹھا کر طاق میں رکھ دیا۔ کتابوں کے ساتھ بستر میں سگریٹوں کے پورے سات ڈبے تھے۔ رام گوپال نے کہا،

"ارے اتنے سگریٹ!"

"جی ہاں، مہارشی۔ ہر ڈبے میں پچاس۔ تم بتاؤ۔ اگر تمھیں دن بھر سگریٹ پینے کے سوا کچھ نہ کرنا ہو تو کتنے پیوگے؟"

"آشرم میں تو کوئی سگریٹ پیتا ہی نہیں۔ شری کرشن جی کہتے ہیں کہ یہ بہت بری عادت ہے۔"

"تم مہارشی اپنے دل کی بات کہو، شری کرشن جی سے مجھے پوچھنا ہوگا تو پوچھ لوں گا۔ تم آٹھ دس تو پی ہی لیتے ہوگے، سگریٹ نہ سہی بیڑی سے تو شوق کرتے ہوگے؟"

"جی نہیں، میں نے کبھی سگریٹ اور بیڑی نہیں پی ہے۔"

گرودیال نے اُسے غور سے دیکھا۔ گویا سوچنے لگا کہ آخر یہ لڑکا اتنا اُبلا کیوں ہے۔ پھر اُس نے سگریٹ جلائی اور دیر تک رام گوپال سے الٹی سیدھی باتیں کرتا رہا۔ اسی دوران میں اُس نے ہینڈ بیگ سے چھوٹی سی کیتلی، چائے دان، پیالی اور سپرٹ کا چولھا نکالا۔ اور رام گوپال سے کیتلی میں پانی اور تھوڑا سا دودھ منگوا کر چائے بنائی۔ پہلے اس نے پیالی بھر کر رام گوپال کے سامنے رکھی، مگر اس نے چائے پینے سے انکار کیا۔

"واہ بھارشی، نہ چائے پیتے ہو نہ سگریٹ۔ تم بڑے ہو کر نہ جانے کیا کر ڈالوگے"

رام گوپال کا جی چاہتا تھا کہ گرودیال کے پاس بیٹھا رہے لیکن پھر اُسے کچھ کام یاد آگئے اور وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ پرارتھنا کے وقت اُس نے دیکھا کہ گرودیال سب سے الگ بیٹھا ہوا تھا گویا اُسے کسی کی پرواہ ہے نہ کسی کی دلچسپی پرارتھنا کے بعد شری کرشن جی اُس کے پاس آئے اور چپکے سے کچھ کہا اور دونوں گروجی کی جھونپڑی کی طرف چلے گئے۔ رام گوپال کو اس کا ڈر نہ ہوتا کہ اس پر ڈانٹ پڑے گی تو وہ جا کر سنتا کہ گروجی اور گرودیال کیا باتیں ہوتی ہیں، مگر اُس نے الگ رہنا ہی بہتر سمجھا۔ گرودیال کی ملاقات نے اس کی طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا کر دیا تھا اور رات کو اپنی خیالی دنیا میں پہنچتے ہی اس نے ایک داستان بنائی جس کا مرکز اس کی اور ایک گرودیال کی شکل کے اجنبی کی دوستی تھی۔ یہ دوستی بہت بڑھ گئی، جاں نثاری کی، محبت کے آنسو بہانے کی نوبت آگئی، اور نیند نے قصہ ختم نہ کر دیا ہوتا تو نہ جانے یہ داستان کتنا طول کھینچتی لیکن نیند نے داستان کے مناظر پر تاریکی کے پردے ڈالنا شروع کر دیا، پہلے ہلکے اور پھر گہرے، اور آخر میں خیالی دنیا کی روشنی بالکل بجھا دی۔ دوسرے دن صبح کو رام گوپال اُٹھا تو رات کی باتیں یاد کر کے بہت شرمایا وہ چاہتا تھا کہ گرودیال کے پاس جائے مگر اس کی ہمت نہ کر سکا، اور دو تین دن تک وہ گرودیال سے دور دور رہا۔ پھر ایک مرتبہ جب وہ باغ میں کام کر رہا تھا تو گرودیال خود ٹہلتا ہوا اُس کے پاس آیا۔

"کیوں بھارشی، میں نے کیا قصور کیا ہے جو آپ مجھ سے خفا ہو گئے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ آپ کے یہاں کوئی مہمان آئے اور آپ اُس سے مُنہ چھپا کر بیٹھ رہیں؟"

رام گوپال نے مارے شرم کے پہلے ہی سر جھکا لیا تھا۔ اب اُس نے مسکرا کر اپنا کھرپا زیادہ زور سے چلانا شروع کر دیا اور اُسے گرودیال سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ ہوئی، وہ گرودیال کی بات کا جواب نہ دے سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُسی نے پوچھا۔

"اچھا بھارشی، یہ تو بتاؤ کہ تم دن بھر کیا کرتے ہو"

رام گوپال نے اُسے اپنے فرائض کی تفصیل بتائی۔

"اور ان کاموں میں تم کو سب سے زیادہ پسند کون ہے؟"

"باغ کا کام۔"

گرودیال نے آشرم کے باغ کو غور سے دیکھا۔ پھر کہا،

"بھئی مہارشی، تم محنت تو کرتے ہو اور کام بھی ضرور جانتے ہوگے، لیکن تمھارا باغ دیکھنے میں کچھ بہت نہیں ہے۔ تمھارا جی چاہے تو جب میں گھر جاؤں تو میرے ساتھ چلو۔ پتاجی نے ایشور جانے کہاں سے ایک مالی ڈھونڈ کر رکھا ہے۔ وہ نہ لوگوں کی کوئی بات سنتا ہے نہ کسی اور کی، مگر جیسا باغ ہمارا ہے ویسا تمھیں شہر میں کہیں اور نہ ملے گا۔ مجھے تو مالی ہمیشہ گھڑکتا رہتا ہے، کیاریوں اور درختوں کے پاس نہیں آنے دیتا، تم کام جانتے ہو، تمھیں شاید اپنی شاگردی میں لے لے۔ اگر تمھیں اس نے چار چھ روز بھی اپنے ساتھ کام کرنے دیا تو پھو جگت استاد بن جاؤ گے۔ اور اس نے یہ جان کر بھی کہ تم مہارشی ہو تمھیں ٹھکا دیا تو میں تمھیں واپس پہنچا جاؤں گا۔ بتاؤ چلوگے؟"

"جی ہاں چلوں گا۔"

اس کے بعد اور باتیں ہوتی رہیں۔ رام گوپال کا جی چاہتا تھا کہ گرودیال اُسے اپنے ساتھ لے جائے، لیکن اُسے ہمت نہ ہوئی کہ اس وقت کی گفتگو گرودیال کو پھر یاد دلائے۔ گرودیال نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے اُسے بڑا تعجب ہوا جب روانگی کے دن گرودیال نے اس سے کہا۔

"بھئی مہارشی، میں نے تمھارے لئے سب طے کر لیا ہے، تمھاری ماتاجی بھی راضی ہیں۔ اب تم اپنا سامان ٹھیک کرلو اور چار بجے میرے ساتھ چلنا۔"

رام گوپال کا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ پھر اُسے اندیشہ ہوا کہ کہیں اُس کی ماں یا کوئی اور اس کی مخالفت نہ کرے اور اس کا جی بیٹھ سا گیا۔ لیکن دوپہر کو وہ گھر گیا تو لکشمی بائی نے اُسے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی، اور جب وہ اپنا بستر لپیٹ کر چلنے لگا تو اُسے چار آنے پیسے دئے اور کہا کہ اپنا خیال رکھنا

رام گوپال اور گرودیال دونوں موٹر پر روانہ ہوئے، رام گوپال شہر کا رستہ اکثر طے کر چکا تھا مگر اب موٹر پر سے ہر چیز نئی معلوم ہو رہی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ گرودیال اُسے امیر ارکے اپنے ساتھ، اپنی بغل میں بٹھا کر لئے جا رہا تھا، کوئی اور لڑکا اتنا ہی خوش ہوتا تو اُس کی زبان کھل

جاتی، رام گوپال کے منہ سے ایک بات نہ نکلی، گردیال بھی کسی سوچ میں تھا۔ رام گوپال نے اُسے دو ایک بار نکھیوں سے دیکھا، اور اُس کی صورت کچھ ایسی تھی کہ رام گوپال کو یقین ہو گیا کہ وہ بھی باتیں کرنا نہیں چاہتا۔

سیٹھ ہنس راج کا مکان آشرم کی سمت میں شہر کے کنارے پر تھا۔ موٹر وہاں دس منٹ میں پہنچ گیا۔ جیسے ہی وہ برساتی میں آکر رُکا، ایک لڑکی سامنے کے کمرے سے نکلی اور اُس نے گردیال کو دیکھتے ہی پکارا،

"اماں، بھیا آگئے"

اس آواز پر ایک ادھیڑ عمر کی بیوی کمرے سے نکلیں، گردیال موٹر پر سے اُتر کر اُن کے پاس گیا، انھیں سلام کیا اور انھوں نے اُس کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد دو تین لڑکیاں اور نکلیں اور گردیال کو گھیر کر کھڑی ہو گئیں۔ سب سے آخر میں ایک لڑکی آئی جو بہت نفیس مگر سادی ساڑی پہنے تھی وہ کچھ اُداس اور کچھ شرمائی ہوئی ایک طرف کو کھڑی رہی۔ یہ گردیال کی بیوی تھی۔ گردیال کی شادی اُس کی مرضی کے خلاف اُس لڑکی سے کر دی گئی تھی، اب وہ کبھی گھر چھوڑ کر بھاگ جانے، کبھی خودکشی کر لینے کی دھمکی دیتا اکثر گھر سے غائب رہتا اور کسی بات میں ماں باپ کی خوشی کا خیال نہ کرتا، اُسی مرض کا علاج کرنے کی نیت سے سیٹھ ہنس راج نے اُسے مجبور کیا تھا کہ ایک ہفتہ آشرم میں جا کر رہے۔ رام گوپال کو یہ سب معلوم نہ تھا وہ گردیال کے ساتھ موٹر پر سے اُترا اور اپنا بستر لے کر الگ کھڑا ہو گیا۔ ادھیڑ عمر کی بیوی، لڑکیاں گردیال، سب زور زور سے باتیں کر رہے تھے، رام گوپال یہ سوچ کر گھبرا رہا تھا کہ کہیں یہ لوگ بُرا نہ مانیں کہ ایک غیر آدمی اُس کی باتیں سُن رہا ہے۔ لیکن اُسے ڈر تھا کہ وہ دور ہٹ گیا تو گردیال اُسے بھول جائے گا۔ اس کا ایک ایک لمحہ گراں گذر رہا تھا اور اُسے بڑا اطمینان ہوا جب گردیال نے نوکر کو پکارا اور اس سے کہا کہ مالی کو بلا لاؤ۔ تھوڑی دیر میں مالی آیا، وہ ایک دُبلا پتلا قلیچن ساٹھ برس کی عمر کا آدمی تھا، مگر خاصا تانٹھا تھا، اور اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا غرور اور اُس کے تیور کچھ ایسے تھے کہ آدمی خواہ مخواہ متاثر ہوتا۔ گردیال لڑکیوں سے باتیں کر رہا تھا اور اس کی طرف فوراً متوجہ نہیں ہوا تو اس نے کہا،

"کہو جی کیا ہے"

گرودیال نے اُسے معاملہ سمجھایا۔ اُس نے رام گوپال پر ایک نظر ڈالی اور بغیر کوئی جواب دیئے منہ پھیر کر چلا گیا۔ گرودیال نے رام گوپال سے کہا،

"مہارشی، تم کھڑے نہ رہو، بس اُس کے پیچھے لگ جاؤ، جو یہ تم سے راضی نہ ہو تو مجھے بتانا"

گرودیال یہ کہہ کر لڑکیوں کے ساتھ مکان کے اندر چلا گیا اور رام گوپال اُسی طرف بڑھا جدھر اُس نے مالی کو جاتے دیکھا تھا۔ لیکن مالی اُسے دکھائی نہ دیا۔ باغ گھر کے چاروں طرف تھا، رام گوپال نے سوچا کہ مالی کو تلاش کرنے کے لئے پورے گھر کا چکر لگانا پڑے گا۔ اگر وہ گھر کی دیواروں اور دروازوں کے قریب قریب چلا تو ممکن تھا کہ کوئی نوکر اُسے چور سمجھ کر پکڑے یا آوارہ سمجھ کر ڈانٹے۔ اگر وہ باغ کے اندر گیا تو اس کا اندیشہ تھا کہ کوئی مالی اُسے گالیاں دے گا۔ اس کے کپڑے ایسے تھے نہیں کہ بڑا آدمی معلوم ہو اور لوگ اس پر کسی طرح کا شبہہ نہ کر سکیں۔ پھر اس کے ہاتھ میں بستر بھی تھا۔ اب وہ افسوس کرنے لگا کہ اس نے موٹر میں سے بستر کیوں نکالا۔ اگر اُسے وہیں چھوڑ دیتا تو وہ محفوظ بھی رہتا اور اس میں شان بھی زیادہ ہوتی کہ اس کا بستر گھر کے مالک کے موٹر میں رکھا رہے۔ رام گوپال تھوڑی دیر سوچ میں کھڑا رہا۔ پھر اُسے اپنی پست ہمتی پر شرم آئی، وہ دل کڑا کر کے برساتی میں واپس گیا، وہاں ایک کونے میں اپنا بستر رکھ دیا اور مالی کو ڈھونڈھ نکالنے کا پکا ارادہ کر کے چلا۔ اس نے اپنی رفتار جان بوجھ کر سست رکھی، اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ رک جاتا اور سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا، کہ اسے دور سے کوئی دیکھے تو اجنبی نہ سمجھے۔ لیکن اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کسی نے ٹوکا تو کیا کہوں گا، اور اس نے کچھ اور کہا تو کیا جواب دوں گا اور اگر وہ اس سے بھی مطمئن نہ ہوا تو کہوں گا کہ گرودیال جی سے میرا سامنا کرا دو۔ مکان کی پشت پر باورچی خانہ تھا، رام گوپال اس کے قریب پہنچا تو اُسے ایک لڑکا دکھائی دیا۔ لڑکے نے پیروں کی آہٹ سن کر نظر تک نہیں اُٹھائی تو رام گوپال نے پوچھا،

"کیوں، چودھری تو ادھر نہیں ہے؟"

"کون چودھری؟ ہم نہیں جانتے۔"

رام گوپال کھسیانا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس سمت میں آگے جانے کی اُسے ہمت نہ ہوئی۔ اس لئے اُس نے طے کیا کہ لوٹ جانا چاہیے۔ برساتی سے ہو کر وہ مکان کی دوسری طرف گیا۔ یہاں اُسے ایک آدمی سامنے سے آتا ہوا ملا اور اُس سے اُس نے مالی کا پتہ پوچھا۔ آدمی نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا، "چودھری ادھر ہیں" اور آگے بڑھ گیا۔ رام گوپال ادھر چلا، جدھر آدمی نے بتایا تھا اور آخرکار باغ کے ایک کونے میں اُسے مالی دکھائی دیا۔ وہ تین چار آدمیوں سے ایک بڑی کیاری میں کچھ پود جلدی جلدی لگوا رہا تھا، رام گوپال اُس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس اُمید میں کہ وہ دیکھے گا تو پہچان لے گا۔ مالی نے بڑی دیر تک اس کی طرف دیکھا نہیں، اور دیکھا تو پہچانا نہیں۔ رام گوپال آنکھ ملتے ہی مسکرایا تھا مگر یہ بھی کچھ کام نہ آیا۔ پھر رام گوپال نے پوچھا،

"یہ کیا لگوا رہے ہو، چودھری؟"

"کنو... ...م۔"

اس کے بعد رام گوپال کیا پوچھتا۔ وہ چپ کھڑا رہا۔ مالی کے تیور دیکھ کر اس کی گھگھی بندھ گئی۔ بے کار کھڑے کھڑے تھک گیا تو اُس نے جان پر کھیل کر کہا،

"چودھری تم اجازت دو تو میں بھی ان آدمیوں کے ساتھ لگ جاؤں۔"

"اب کام کا وقت نہیں رہا ہے۔"

رام گوپال پھر چپ ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ جتنا وقت گذرتا جاتا ہے اس پر ہیبت طاری ہوتی جا رہی ہے۔ آخرکار اُس نے طے کیا کہ وہاں کھڑے رہنے سے فائدہ نہیں، وہ پھر برساتی میں واپس آیا، اور یہاں کھڑا ہو گیا۔ ایک کمرے سے گردیال اور دو تین لڑکوں کے بولنے اور کبھی کبھی ہنسنے کی آواز آتی تھی۔ رام گوپال کے جی میں آیا کہ کمرے کا دروازہ کھٹکھٹائے، لیکن گردیال سے وہ کہتا کیا؟ اور اگر گردیال کی جگہ کوئی لڑکی دروازہ کھولتی تو؟ رام گوپال نے کچھ دیر سوچ کر طے کیا کہ دروازہ کھٹکھٹانا مناسب نہ ہوگا۔ لیکن پھر کیا کرنا چاہیئے؟ اگر گردیال یہ بھول گیا کہ وہ کسی کو آشرم سے اپنے ساتھ

دیاہے ؟ اور پھر کھانا کہاں ہوگا اور کب ہوگا ؟ لڑکیوں کے ساتھ، بڑے سے کمرے میں ؟ مالی کی کوٹھری میں ؟ نوکروں کے ساتھ ؟ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر ؟ رام گوپال کو معلوم ہوا کہ اس دنیا میں اس کا کوئی ولی وارث نہیں۔ بڑا گھر اور سرسبز باغ اُسے کاٹے کھاتا تھا۔ اب اسے ایکبار گی آشرم یاد آیا وہاں اس کی ماں تھی، بہت سے لوگ جن سے وہ مانوس تھا، مقرر کام، اور کام سے طبیعت اکتا جائے تو ایک خیالی دنیا جہاں وہ بن کی موجوں کے ساتھ اُچھلتا، بیٹھتا، اور جدھر جی چاہتا بہ جاتا۔ رام گوپال کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ اس نے لپک کر اپنا بستر اُٹھایا اور چپکے سے چل دیا۔

رستے میں اُسے کئی مرتبہ خیال آیا کہ وہ بڑے گھر اور بے پروا آدمیوں سے ڈر کر بھاگا ہی، اور یہ اچھا نہیں اگر وہ اتنا ڈرپوک نہ ہوتا اور اُس نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر گردیال کو باہر بلایا اور اُسے سارا ماجرا سنایا ہوتا تو وہ ضرور اُس کے لئے کوئی انتظام کرتا، اس کے رہنے کو کمرہ دیتا، اس سے پوچھتا کہ کب کھاؤگے، کیا کھاؤگے، خود اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا۔ اسے گھر کی لڑکیوں سے، اپنے ماں باپ سے ملاتا، کہتا کہ یہ آشرم سے آئے ہیں، باغ کا کام سیکھنا چاہتے ہیں۔ اور مالی کی کیا مجال تھی کہ وہ کام نہ دے۔ باغبانی کے گُر نہ بتلائے۔ سب کچھ ہو سکتا تھا۔ لیکن اب تو آشرم ہی واپس جانا تھا۔ پچھلے گھنٹے دو گھنٹے میں جو کچھ ہوا تھا اس کی یاد بھلانے کے لئے رام گوپال اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ آشرم کی زندگی کتنی پیاری، کتنی سادی اور پرسکون ہوتی ہے۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے چپکے چپکے وہ بھجن گانا شروع کردے۔ جو بار بار تھنا میں گائے جاتے تھے، اور آہستہ آہستہ اس پر ایک خاص روحانی کیفیت طاری ہوگئی۔ اُسے دور سے وہ باڑ دکھائی دی جو آشرم کے چاروں طرف لگی تھی تو اس کے دل میں شوق اور مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، اس کی طبیعت ہلکی ہوگئی، قدم تیز تیز اُٹھنے لگے۔

لکشمی بائی اپنے جھونپڑے کے سامنے بیٹھی تھیں، رام گوپال کو دیکھ کر خوش ہوئیں، مگر انھوں نے کہا،

"ارے تو تو چار دن کے لئے گیا تھا!"

"اماں مجھے وہاں اچھا نہیں لگا۔"

"خیر، پھر، اچھا کیا چلے آئے۔"

اب سورج ڈوب چکا تھا، پرارتھنا کا وقت قریب آرہا تھا۔ رام گوپال نے جلدی سے چار کنوئیں پر پانی بھرا اور شہر کی خاک بدن سے دھوئی۔ پرارتھنا کا گھنٹہ بجا اس کی اس کیفیت کا اثر کچھ باقی تھا جو رستے میں اس کے دل پر چھاگئی تھی اور پرارتھنا میں وہ اس طرح شریک ہوا کہ جیسے اس کی کوئی بڑی مراد پوری ہوگئی۔ عام طور پر وہ چپ بیٹھا رہتا تھا، نہ پاٹھ زور زور سے کرتا نہ سب کے ساتھ بھجن گاتا۔ اس لئے کہ وہ شرماتا بہت تھا اور گلے کے جو استاد آشرم میں تھے وہ بہت دن ہوئے اس سے کہہ چکے تھے کہ بیٹا تم زور سے نہ گایا کرو، تمہاری آواز بے سری ہے۔ مگر اس روز رام گوپال کی جھجک بالکل مٹ گئی تھی۔ وہ ارد گرد کے لوگوں سے ایسا بے خبر اور پرارتھنا میں منہمک تھا کہ گویا وہاں اس کے سوا کوئی اور موجود نہیں۔ پاٹھ کے بعد بھجن شروع ہوئے تو یہ بھی رام گوپال نے گائے۔ پہلے دبی آواز میں اور پھر پورے گلے سے۔ آس پاس جو لوگ بیٹھے تھے وہ کچھ سمجھ نہ سکے کہ کیا بات ہے، وہ بار بار اس کی طرف گھوم کر دیکھتے، مگر رام گوپال کو اس کا احساس نہ ہوا۔ لڑکیاں شروع ہی سے رام گوپال کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھیں۔ دوسروں کو اس کی طرف متوجہ پاکر بعض بعض کھلکھلانے لگیں۔ لڑکیوں اور لڑکوں میں ہنسی وبا کی طرح پھیلتی ہی رفتہ رفتہ بیشتر گانے والے ہنسی کی وجہ سے چپ ہوگئے، اور رام گوپال کی آواز اور نمایاں ہوگئی۔ اب رام نام کی ضربیں لگائی جارہی تھیں، جن کا اس پر خاص اثر ہوتا تھا:

رگھوپتی، راگھو، راجا رام۔ پتیت پاون سیتا رام

رگھوپتی، راگھو، راجا رام . . . . .

رگھوپتی، راگھو، راجا رام . . . . .

رگھوپتی، راگھو، راجا رام . . . . .

رام گوپال گارہا تھا اور جھوم رہا تھا۔ اس کا منہ پھیل گیا تھا، آنکھوں سے مسرت کے آنسو بہ رہے تھے، دل، دماغ، حواس سب رام نام میں گم ہوگئے تھے۔

مسلمان اور اسکاؤٹنگ کی تحریک

اسکاؤٹ دو قسم کے ہوتے ہیں، فوجی اور غیر فوجی، ان میں سے فوجی اسکاؤٹ کا کام دشمن کا پتہ چلانا، فوج کے آگے چلنا اور خبر رسانی وغیرہ ہوتا ہے۔ غیر فوجی اسکاؤٹ امن کے زمانے میں بہت سی قسم کے کام کرتے ہیں۔ ہندوستان میں غیر فوجی اسکاؤٹ کی دو بڑی جماعتیں ہیں ایک "بیڈن پاؤل اسکاؤٹ" کہلاتے ہیں اور دوسرے "ہندوستان اسکاؤٹ" کے نام سے مشہور ہیں۔

۱۸۹۹ء میں بیڈن پاؤل بور لوگوں سے لڑنے کے لئے جنوبی افریقہ بھیجے گئے۔ یہ لڑائی ۱۲ اکتوبر ۱۸۹۹ء سے یکم مئی ۱۹۰۰ء تک جاری رہی۔ بیڈن پاؤل نے لڑائی کے دوران میں مرہم پٹی، خبر رسانی اور اردلی وغیرہ کے کام سپاہیوں کی بجائے ۱۴ سال سے ۱۶ سال تک کے لڑکوں سے لئے تاکہ اس طرح لڑائی کے مورچے پر زیادہ سے زیادہ تعداد میں سپاہی کام کر سکیں۔ لڑکوں نے تھوڑی سی ٹریننگ کے بعد یہ کام بہت بہادری اور دلچسپی کے ساتھ انجام دیا۔ اسی وقت سے بیڈن پاؤل کے دل میں اسکاؤٹنگ کی تحریک شروع کرنے کا خیال پیدا ہوگیا۔ لڑائی میں فتح حاصل کرنے کے بعد جب بیڈن پاؤل انگلستان تشریف لائے تو اُن کی شہرت بہت بڑھ چکی تھی اسی اثنا میں انھوں نے اسکاؤٹنگ کے متعلق ایک کتاب بھی لکھی جو بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ انھوں نے یہ کتاب اصل میں فوجی سپاہیوں کے لئے لکھی تھی مگر اسکولوں اور کالجوں کے لڑکوں نے اس کتاب کو بہت زیادہ پسند کیا جس کی وجہ سے بیڈن پاؤل نے یہ خیال کیا کہ اگر یہ کتاب لڑکوں ہی کی زبان میں لکھی جائے تو اور زیادہ دلچسپ اور مفید ثابت ہوگی چنانچہ انھوں نے اس کام کو شروع کر دیا۔ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے "بوائے اسکاؤٹنگ" کے نام سے ایک اسکیم تیار کی جس کی بنیاد کھیلوں کے ذریعے تعلیم پر رکھی۔ انھوں نے اسکاؤٹنگ کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے:

"اسکاؤٹنگ ایک ایسا کھیل ہے جو فرصت کے اوقات میں صاف اور کھلی ہوا میں کھیلا جاتا ہے جس میں بڑا بھائی چھوٹے بھائی کے ساتھ کھیل میں حصہ لیتا ہے تاکہ وہ ان کو تندرست و توانا، خوش و خرم ایک اچھا

شہری بناسکے۔ اسکاؤٹنگ لڑکوں کو روشن دماغ جسمانی اعتبار سے مضبوط اور نیک چلن بناتی ہے۔

اسکاؤٹنگ کی اسکیم کو انھوں نے ذیل کے عنوان میں تقسیم کیا ہے:۔

۱۔ جنگلات کا علم؛ جس میں جانوروں، پرندوں، جڑی بوٹیوں اور پھلوں اور پھولوں کے متعلق معلومات شامل ہیں۔

۲۔ پائینرنگ؛ جس میں گرہیں لگانا، کلہاڑی کا استعمال، پل بنانا، جھنڈی سے بات چیت کرنا شامل ہے۔

۳۔ کیمپنگ؛ جس میں کھلے میدان میں اپنی حفاظت کرنا، خیمے لگانا، جھونپڑی بنانا، آگ جلانا اور کھانا پکانا وغیرہ شامل ہیں۔

۴۔ کم زوروں اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا، جان بچانا، آگ بجھانا اور مرہم پٹی وغیرہ۔

۵۔ قوتِ برداشت؛ جس میں جسمانی ورزش اور کھیل وغیرہ شامل ہیں۔

۶۔ حب الوطنی: یعنی ملکی ضرورت کو اپنی ضروریات پر ترجیح دینا۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں بیڈن پاول نے اس اسکیم کو آزمانے کے لیے براؤن ڈوی جزیرے میں بطور تجربہ ایک کیمپ کیا جس میں انھوں نے امتحانات اور بیجز کے ذریعے کھیل، کیمپنگ، حادثات کا مقابلہ کرا کر لوگوں میں اتنی دلچسپی پیدا کی کہ اس کیمپ کے بعد لاتعداد لڑکے اور اسکاؤٹنگ کی طرف ٹوٹ پڑے۔ سنہ ۱۹۰۸ء تک بیڈن پاول نے اپنی اس اسکیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جس کے بعد انھوں نے اپنی کتاب "اسکاؤٹنگ فار بوائز" شائع کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی آج بھی اس کو اسکاؤٹنگ کی دنیا میں وہی مقبولیت حاصل ہے جو اس وقت تھی۔ انھوں نے اس کے علاوہ تین اور چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) ایک مشورہ (۲) اسکاؤٹ اسکیم کا خلاصہ (۳) ایک کامیاب آزمائش

انگلستان میں اسکاؤٹنگ کو ترقی دینے کے لئے انھوں نے اسکاؤٹنگ افسروں کی ٹریننگ کا انتظام کیا۔ وائی، ایم سی اے کلب، اسکولوں، کالجوں اور محلوں میں اسکاؤٹ ٹروپ قائم کئے اور اس طرح دو ہی سال میں انگلستان میں اسکاؤٹوں کی تعداد ۱۲۴۰۰۰ ہو گئی۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں مسٹر ڈی ایس بوائز کے ذریعے اسکاؤٹنگ کی تحریک امریکہ میں بھی پہنچ گئی۔ امریکہ والوں نے سنہ ۱۹۱۰ء میں اپنے ملک کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے امریکہ میں بھی شروع کر دیا۔ سنہ ۱۹۱۱ء تک اسکاؤٹنگ کی تحریک ہندوستان،

افریقہ اور جرمنی وغیرہ تمام ممالک تک پہنچ گئی تھی سنہ ۱۹۱۲ء میں بیڈن پاول نے دنیا کا ایک سفر کیا اور سنہ ۱۹۲۰ء میں لندن کے تمام دنیا کے اسکاوٹس کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں دنیا کے نمائندوں نے بیڈن پاول کو متفقہ طور پر تمام دنیا کا چیف اسکاوٹس منتخب کیا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں اسکاوٹنگ کی یہ تحریک ہندوستان میں بھی جاری کی گئی مگر صرف انگریز بچوں کے لئے ہندوستانیوں کو اس سے بالکل محروم رکھا گیا۔ اس پر مسز اینی بسنٹ نے بیڈن پاول سے درخواست کی ہندوستانیوں کے لئے بھی اس کا دروازہ کھول دیا جائے مگر بیڈن پاول صاحب نے سیاسی مصالح کی بنا پر اس درخواست کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جواب میں فرمایا کہ ہندوستانی اس قابل ہی نہیں کہ اسکاوٹنگ سیکھ سکیں۔ اس سے ان میں بغاوت کے جذبات پیدا ہوں گے جو ہم انگریزوں کے حق میں مضر ہوں گے۔ مسز اینی بسنٹ کو ان کا یہ جواب ناگوار معلوم ہوا اور انھوں نے سنہ ۱۹۱۶ء میں ایف جی پیرز کی مدد سے اسکاوٹ ماسٹروں کی ٹریننگ کے لئے ایک کیمپ بنارس میں شروع کیا اور سنہ ۱۹۱۸ء میں جنوبی ہند میں انڈین بوائے اسکاوٹ ایسوسی ایشن کے نام سے ایک مجلس قائم کی اور شمالی ہند میں مدن موہن مالویہ اور پنڈت ہردے ناتھ کنزرو نے پنڈت ایس۔ آر باج پائے کی مدد سے "سیوا سمتی بوائے اسکاوٹ" کی بنیاد رکھی۔ سیوا سمتی نے "سیوا سمتی بوائے اسکاوٹ ایسوسی ایشن" کی مالی امداد کی اور سنہ ۱۹۳۷ء تک اس انجمن نے اپنے ممبروں کی تعداد گورنمنٹ کی مخالفت کے باوجود .... ۱۵ اکرلی سنہ ۱۹۲۱ء میں بیڈن پاول ہندوستان تشریف لائے، اور تمام اسکاوٹ انجمنوں کو آپس میں ملا کر ایک کرنے کی کوشش کی اور اسکاوٹنگ کی بنیاد ہندوستان میں رکھی گویا اس طرح سے سنہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستانیوں کے لئے بھی اسکاوٹنگ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ بوائے اسکاوٹ ایسوسی ایشن میں وہ تمام انجمنیں شامل ہو گئیں جو مختلف مقامات پر مختلف ناموں سے بن گئی تھیں۔ صرف "سیوا سمتی بوائے اسکاوٹ ایسوسی ایشن" الگ رہی اس لئے کہ انھوں نے اس اس چیز کو سمجھ لیا تھا کہ وہ بوائے اسکاوٹ کے ذریعے ہندوستانیوں کے دلوں پر برطانوی شہنشاہیت کی مہر لگانا چاہتے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ اسکاوٹنگ کو انگریزی حکومت کے اثر سے بالکل پاک رکھا جائے۔ اس کا پروگرام خود ہندوستانیوں ہی کا بنایا ہوا ہو۔ اس کا جھنڈا یونین جیک نہ ہو بلکہ ایک علیحدہ جھنڈا بنایا جائے مگر ان کی ایک بات

نہ سنی گئی۔ چنانچہ آج ہندوستان میں "بوائے اسکاؤٹ ایسوسی ایشن" محض اس لئے قائم ہے کہ سرکاری افسروں کو خوش رکھا جائے اور اس میں جو کچھ بھی جان باقی ہے وہ محض حکومت کے دم سے ہے بسنہ ۱۹۳۷ء میں بیڈن پاول دوبارہ ہندوستان تشریف لائے۔ دہلی میں آل انڈیا کانفرنس ہوئی۔ ہندوستان سے واپس جاتے وقت انھوں نے ہندوستانیوں کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا اس کو ہندوستانیوں نے بہت ناپسند کیا۔ شاکی تو پہلے ہی سے تھے۔ اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر بہت سے قوم پرست بوائے اسکاؤٹ ایسوسی ایشن سے علیحدہ ہوگئے۔ سیوا سمتی بوائے اسکاؤٹ ایسوسی ایشن نے بھی اپنا نام بدل کر ہندوستان اسکاؤٹ ایسوسی ایشن رکھ لیا اور بہت سی اسکاؤٹ جماعتیں جو ادھر اُدھر قائم ہوگئی تھیں اس کے ساتھ شامل ہوگئیں۔ "ہندوستان اسکاؤٹ ایسوسی ایشن" کے ممبروں کی تعداد اس وقت دو لاکھ سے بھی زیادہ ہے مگر بدقسمتی ہے کہ مسلمان اسکاؤٹوں کی تعداد اس میں ۵ فی صدی سے زیادہ نہیں ہے اور جو مسلمان شامل بھی ہیں ان میں سے بھی بہت سے ہندوستان اسکاؤٹ ایسوسی ایشن کے پروگرام کو پسند نہیں کرتے، جے جے کارے، بندے ماترم کے ترانے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں اُن کو ایک آن نہیں بھاتیں۔ ملک میں جو سیاسی ہیجان ایک عرصے سے ہے۔ سیاسی آزادی کی خواہش اور آزادی میں مُلک کی مختلف قوموں کی حیثیت پر جو کچھ اس زمانے میں سوچا اور کیا جا رہا ہے تعلیمی اور تربیتی تحریکوں میں اپنے تمدن سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کا خیال جو روز بروز گہرا اور واضح ہوتا جاتا ہے۔ ان سب نے مسلمانوں کے لئے اسکاؤٹنگ کے دونوں موجودہ اداروں کو نامناسب سا بنا دیا ہے۔ وہ ایک جگہ شہنشاہیت کی تائید سے بھاگتے ہیں دوسری جگہ اپنی تمدنی روایات کی وہ اہمیت نہیں پاتے جس کے بغیر ان کی ذہنی اور روحانی تسکین ممکن نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ نہ اُس میں شریک ہوتے ہیں نہ اس میں اور یوں تربیت کے ایک نہایت اہم نظم سے محروم رہ جاتے ہیں۔ مل جل کر رہنے کھلی ہوا میں سپاہیانہ زندگی گذارنے، اپنی مذہبی زندگی کو ہم عمروں کی جماعت میں صحیح طور پر نشوونما دینے کے مواقع انھیں حاصل نہیں ہوتے۔ مسلمان بچوں اور نوجوانوں کو ان مواقع سے محروم رکھنا ان کی تعلیم کو ناقص رکھنا ہے۔ اور قوم کی تعلیم و تربیت کا کام کرنے والوں کو اس طرف فوری توجہ کرنی چاہیے۔ اسلام نے مسلمان کو

سپاہی بننے کا سبق سکھایا تھا وہ اس کو بھولتا جاتا ہے اور روز بروز پستی کی طرف مائل ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ مسلمان اب اس خوابِ غفلت سے جاگیں اور اپنا بھولا ہوا سبق یاد کریں۔ اس لئے ہماری کوشش یہ ہے کہ بچپن ہی سے ان کو اسکاوٹنگ کی ٹریننگ دے کر ان کی دماغی اور اخلاقی نشوونما کی جائے لیکن صرف اسکاوٹنگ کا موجودہ پروگرام جو "ہندوستان اسکاوٹ ایسوسی ایشن" اور بوائے اسکاوٹ ایسوسی ایشن نے پیش کیا ہے۔ ہمارے قومی وملی مقاصد کے لئے کافی نہ ہوگا۔ بغیر اسلامی روح کے یہ پروگرام بیجان سا رہے گا۔ اس لئے وہ اسکاوٹنگ جو ہم چاہتے ہیں اس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ لڑکے کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے دماغی، اخلاقی اور جسمانی تربیت کو اسلام کی تعلیم سے مربوط کرکے چلائے۔

مسلمان نوجوانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ کچھ ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جو مسلمانوں میں اس سلسلے میں دلچسپی پیدا کرسکیں۔ اور وہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ جب ان کی حالت اور اُن کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسکاوٹنگ کا ایک ایسا پروگرام تیار کیا جائے جس میں اسلامی تہذیب وتمدن اور مسلمانوں کی قومی زندگی کی جھلک ہو۔

جامعہ میں اس قسم کے اسکاوٹ پروگرام کا تجربہ کیا جارہا ہے۔ ہماری تحریک کا مقصد یہ ہے کہ مسلم نوجوانوں اور بچوں کی تہذیبِ نفس اور تعمیرِ سیرت میں عملی مدد دے اور انھیں اس قابل بنائے کہ وہ خدمتِ خلق اور امدادِ باہمی کے ذریعے سے اپنی اور دوسروں کی جسمانی اور ذہنی، اخلاقی اور روحانی قوتوں کی نشوونما دیں۔ مضبوط اور تندرست، مستعد اور چست رہنے کے طریقے سیکھیں مشق اور تربیت سے قوتِ مشاہدہ اور قوتِ ادراک کو بڑھائیں، تحمل، جفاکشی، خوداعتمادی، خودداری اور دیانت کی عادتیں پیدا کریں اور ان میں سے ہر ایک اپنی مخصوص خداداد صلاحیتوں کی بنا پر اس مقصد کو پورا کرسکے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

حالات حاضرہ

مسٹر چرچل روس ہو آئے۔ اتحادی لیڈروں کی ایسی کوئی ملاقات ہوتی ہے تو جرمن سمجھتے ہیں کہ بس اب آخر کار ان میں جھگڑا ہو جائے گا، اور جرمنی کے گرد جو گھیرا بنا ہے وہ ٹوٹ جائے گا۔ جرمنوں کی جان بچنے کی یہی صورت رہ گئی ہے کہ اتحادیوں میں ایسی پھوٹ پڑ جائے جو کسی فریق کے جوش کو ٹھنڈا کر دے اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ ہر اتحادی کانفرنس کو غلط فہمیوں کا نتیجہ اور فساد کا سبب فرض کرتے ہیں وہ لوگ جو دنیا میں امن اور قوموں کے درمیان صلح چاہتے ہیں جانتے ہیں کہ ان کی امیدوں کا دارو مدار اتحادیوں میں اعتبار اور دوستی قائم رہنے پر ہے اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ اتحادی لیڈروں کی ہر ملاقات ان کی سیاست میں ہم آہنگی اور ان کے دلوں میں صفائی پیدا کرے۔ مسٹر چرچل اور مارشل سٹالن کی ملاقات نے جرمنی کے لیڈروں کو تو اور بھی مایوس کر دیا ہوگا، کیونکہ مشورہ کرنے کے بعد یہ دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ جرمنی کے خلاف جنگ بہرحال جاری رہے گی اور اس کی شدت بڑھتی جائے گی لیکن اور معاملات میں صرف تبادلہ خیال ہوا جنوب مشرقی یورپ کے بارے میں اتنی باتیں طے ہو گئی ہیں کہ کام چلتا رہے اور کوئی اختلاف پیدا نہ ہو۔ پولینڈ کے مسئلے پر گفتگو جاری ہے اور ممکن ہے پولینڈ کی جلاوطن حکومت اور قومی کمیٹی اور روس کے درمیان ایسا سمجھوتہ ہو جائے جس سے سب مطمئن ہوں۔ مسٹر چرچل نے اس کی امید دلائی ہے کہ دسمبر میں ان کی، مارشل سٹالن اور متحدہ ریاستوں کے صدر کی ملاقات ہوگی اور اس موقع پر وہ مسئلے طے ہو جائیں گے جن کے بارے میں فیصلہ کرنا فی الحال ملتوی کر دیا گیا ہے

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کانفرنس میں اس سے زیادہ اور کچھ کیا نہیں جا سکتا تھا۔ روسی سیاست نے چند مقاصد مقرر کر دیئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جرمنی کو شکست دی جائے گی، استھونیا Esthonia لیتویہ Latvia اور لیتھونیا Lithuania کو روسی دفاق میں شامل کر لیا جائے گا، کرزن لائن کے

مشرق میں پولینڈ کا جو حصہ ہے وہ سفید روس یا اوکرائینی جمہوریہ میں ملا دیا جائے گا، بس ارابیہ [illegible] اور مولداویہ [illegible] بھی روسی علاقے سمجھے جائیں گے۔ اس کے علاوہ روسی چاہتے ہیں کہ فن لینڈ پولینڈ، چکوسلوواکیہ اور جنوب مشرقی یورپ کے ملکوں کی سیاست پر ان کا اتنا اثر رہے کہ آگے چل کر کبھی ان کے خلاف یورپی ریاستوں کا کوئی اتحاد قائم نہ ہو سکے اور روس ہر دشمن کے حملے سے محفوظ رہے لیکن ان مقاصد کے علاوہ جو مقرر کئے جا سکے ہیں روس کے لئے ترقی کے اور امکان ہوں گے جو ابھی نظر میں نہیں ہیں اور روسی اپنے آپ کو اس طرح پابند نہیں کرنا چاہتے کہ ہر موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ انھیں ابھی تعینی طور پر معلوم نہیں ہے کہ ایشیا کی سیاست کا کیا رنگ ہوگا، اس لئے وہ اس سے الگ رہنا چاہتے ہیں اور مسٹر چرچل نے کانفرنس کے بارے میں جو رپورٹ دی ہے اس سے اس خیال کی تصدیق نہیں ہوتی کہ انھوں نے روس کو جاپان کے خلاف اعلان جنگ کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ ایسی حالت میں روس اور اتحادیوں کے درمیان ویسے ہی سمجھوتے ہو سکتے ہیں جنھیں مسٹر چرچل کام چلانے کے لئے کافی سمجھتے ہیں، اور اتحادی اور روسی لیڈروں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں تو ہر نئی صورت حال کے مناسب سمجھوتے اور فیصلے کئے جائیں گے۔

سیاست کے ساتھ تجارت میں بھی روسی اپنے لئے نئی راہیں نکال رہے ہیں، انھوں نے ایرانی حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ انھیں شمالی ایران میں تیل نکالنے کا ٹھیکہ دیا جائے۔ ایرانی حکومت نے یہ عذر کیا کہ جنگ کے دوران میں ایسے کاروباری معاملے کرنا مناسب نہیں ہے اور روسیوں کے مطالبے کو منظور نہیں کیا۔ اب روس کے نائب وزیر خارجہ طہران میں ہیں اور ٹھیکے کے معاملے کی پیروی کر رہے ہیں ماسکو ریڈیو کی ایک خبر کے مطابق انھوں نے ایک بیان دیا ہے کہ ایرانی حکومت نے ٹھیکہ دینے سے انکار کرکے روس کے سیاسی حلقوں میں ناگواری پیدا کی ہے اور اس طرح وہ ایران اور روس کے درمیان بگاڑ پیدا کر سکتی ہے۔ ایک پریس کانفرنس میں انھوں نے کہا کہ روس اور ایران میں ویسی ہی دوستی ہو جیسے کہ پہلے تھی، لیکن ایرانی وزارت نے بدعہدی کا جو رویہ اختیار کیا ہے اس کی وجہ سے روسی حکومت ان سے اتحاد عمل نہیں کر سکتی[۵]۔ ایک انگریزی اخبار Observer نے لکھا ہے کہ ایران نے برطانیہ، متحدہ

---

[۵] Dawn. 30.10.44. p.6c.2.

ریاستوں اور روس کو دوران جنگ میں تیل کے ٹھیکے دینے سے انکار کر دیا ہے، اور ممکن ہے اس کا نتیجہ یہ ہو کہ موجودہ ایرانی وزارت ٹوٹ جائے۔ ماسکو ریڈیو ایرانی حکومت اور وزیر اعظم محمد سعید کی مسلسل مخالفت کر رہا ہے اور ایرانی حکومت پر الزام لگا رہا ہے کہ اس نے جنگ کے اس سامان کو جو امریکہ نے روس کو بھیجا تھا پہنچانے میں جان بوجھ کر رکاوٹیں ڈالیں۔ ان رکاوٹوں کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ ایران کے راستے سے روس کو سامان قریب تین سال سے جا رہا ہے، لیکن روسیوں نے یہ الزام اسی وقت لگایا جب ایرانی حکومت نے تیل کے معاملہ میں ان کی خواہش پوری نہیں کی۔ اسی انگریزی اخبار کا نامہ نگار لکھتا ہے کہ اس الزام کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ روس ایران کو اس معاہدے کی خلاف ورزی کا ذمہ دار ٹھیراتا ہے جو ان دونوں کے درمیان ۱۹۴۲ء میں ہوا تھا، اور روسی اب یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی اس معاہدے کے پابند نہیں ہیں۔ معاہدے کی ایک شرط یہ تھی کہ روسی ایران کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیں گے اور معاہدے کی پابندی نہ رہی تو یہ شرط بھی نہ رہے گی۔ ایران کے اندرونی کی مخالفت برابر بڑھ رہی ہے۔ خاص طہران میں ایک "آزادی کا محاذ" قائم ہوا ہے جس کی روس سرپرستی کر رہا ہے، اور کوئی تعجب نہیں کہ ایران میں ایک انقلاب ہو جو موجودہ وزارت کو برطرف کر دے، اور ایک نئی وزارت اس کی جگہ آ جائے جو روس کے مطالبے کو ماننے پر راضی ہو[1]۔

تیل کے ٹھیکے کا مسئلہ یقیناً روسیوں کی خواہش کے مطابق طے ہو جائے گا، لیکن سیاست کے اور مسئلے زیادہ پیچیدہ ہیں۔ یونان کا بیشتر حصہ آزاد ہو گیا ہے اور ایتھنز پھر یونانی ریاست کا دارالسلطنت ہو گیا ہے۔ خطرہ اور مصیبت میں لوگ عام طور پر آپس کے جھگڑوں کو بھول جایا کرتے ہیں، یونان میں پارٹیوں کی تعداد بڑھتی رہی ہے اور مسٹر چرچل نے اپنی پچھلی تقریر میں اس پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ یونان کی مختلف پارٹیوں میں اب تک اتحاد کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے۔ اس کے باوجود یونان کے وزیر اعظم نے دعویٰ کیا ہے کہ جنوبی البانیہ، جنوب مغربی بلغاریہ کا ایک حصہ شمالی سائپرس اور ڈوڈیکانیز جزیرے یونان کے ہیں اور اسے ملنا چاہئیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ یونان کا یہ مطالبہ حق بجانب ہے یا نہیں، اور یونانیوں

---

[1] Dawn 30.10.44.p.6c.1

کو اس پر آمادہ کرنا ہوگا کہ وہ اس فیصلے کو مان لیں، چاہے وہ ان کے حق میں نہ ہو۔ ہالینڈ نے مطالبہ کیا ہے کہ اسے شمال مغربی جرمنی کا کچھ حصہ دیا جائے، یا اس کی کوئی تدبیر کی جائے کہ جرمنی نے اس کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی ہو جائے جنرل دے گول چاہتے ہیں کہ دریائے رھائن فرانس کی مشرقی سرحد مانا جائے یعنی آلساس اور لورین کے علاوہ جرمنی کے وہ علاقے جو لکسمبرگ کے جنوب اور مشرق میں ہیں فرانس کو دے دیئے جائیں اتحادیوں نے اب جنرل دے گول کی حکومت کو باضابطہ فرانسیسی حکومت کا مرتبہ دے دیا ہے، اور اس طرح فرانسیسیوں کی ایک شکایت دور ہو گئی ہے، لیکن جنرل دے گول ان مشوروں میں شریک نہیں کئے گئے ہیں میں یہ طے ہوا کہ جرمنی میں اتحادیوں کی عملداری کس طرح پر ہوگی اور ان کی حکومت کا رویہ اور اس کے مقاصد کیا ہوں گے، جنرل دے گول نے کہا ہے کہ وہ ایسے فیصلوں کے پابند نہ ہوں گے جن میں فرانس کی اہمیت اور اس کے حق کا پورا لحاظ نہ کیا گیا ہو، اور غالباً وہ اس کی ہر طرح سے کوشش کریں گے کہ جو باتیں ان کے نزدیک فرانس کے مفاد کے خلاف ہیں وہ رد کر دی جائیں اور ان کی جگہ نئے فیصلے کئے جائیں۔ وہ اس کا بھی اہتمام کر رہے ہیں کہ فرانس کا اس کی افریقی اور ایشیائی مقبوضات پر جلد دوبارہ تسلط ہو جائے، اور اس معاملے میں ان کی چین اور متحدہ ریاستوں کے ان لیڈروں سے بحث ہوگی جو کہتے ہیں کہ جنگ کے بعد پرانی وضع کی شہنشاہی کو پھر سے قائم نہ کرنا چاہیے۔ لیکن برطانیہ نے فرانس کی تائید کی ہے اور غالباً اصولی بحث کرنے والے اپنے خیالات بیان کر دینے کے بعد بھی وہی کریں گے جس میں مصلحت ہو۔

یورپی نازیوں نے عملی پیش قدمی ہسپانیہ میں شروع کی تھی، اور اب جو فاشسٹ اور نازی قوتیں جنگ کے اور میدانوں میں شکست کھا رہی ہیں تو ہسپانیہ کے جمہوریت پسندوں نے پھر سر اٹھایا ہے پہلے جرمن اور پھر فرانسیسی ذریعوں سے خبر آئی ہے کہ شمال مغربی ہسپانیہ میں جنرل فرینکو کے مخالف اتنی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں کہ سرکاری فوجوں سے باقاعدہ جنگ کر سکیں، اور جرمن بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بغاوت خاصی خطرناک ہو سکتی ہے جب تک جرمنی سے بڑے پیمانے پر جنگ ہو رہی ہے ہسپانیہ کے باغی اور ان کی کارروائیاں کوئی خاص شہرت نہ حاصل کر سکیں گی لیکن یہ بہت ممکن ہے کہ ہسپانیہ کو خانہ جنگی کی مصیبتیں دوبارہ بھگتنا پڑیں اور

وہاں کا فساد یورپی سیاست کا ایک تکلیف دہ مسئلہ بن جائے۔

جنگ کے محاذوں پر نظر ڈالیے تو سوا اس کے کہ امریکی فوجیں جزائر فلی پائن میں اتاری گئی ہیں اور اسی سلسلے میں جاپانی بیڑے نے زبردست شکست کھائی ہے، اور کوئی نمایاں واقعہ نہیں ہوا ہے۔ امریکی فوجیں اپنی موجودہ رفتار سے بڑھتی رہیں تو ان کا جزائر فلی پائن پر بہت جلد قبضہ ہو جانا چاہیے، اور جاپانی بیڑے کو ایسا صدمہ پہنچا ہے کہ اب وہ ایک عرصے تک بڑے مقابلے سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ امریکی فوج اور بیڑا ہر طرح سے تعریف کا مستحق ہے، اور اس میں اس کا کوئی قصور نہیں کہ اسکی کارگذاری کے نفع نقصان کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہے کہ اس سے چین کو کتنا فائدہ ہوگا اور کب۔ جاپان کو پوری شکست جبھی دی جا سکے گی جب امریکی فوجیں چین میں اتاری جائیں اور انھیں مدد پہنچانے اور ان کی کامیابیوں سے فائدہ اُٹھانے کے لیے چین میں ایک قومی حکومت موجود ہو ایسا نہ ہوا تو بڑی دشواریاں پیش آئیں گی لیکن ابھی گھبرانے کی کوئی بات نہیں امریکی جس رفتار سے بڑھ رہے ہیں وہ آپ کو معلوم ہے، چینی حکومت بھی اپنے استقلال کا ثبوت دے چکی ہے۔

یورپ کے مشرقی محاذ پر روسی پیش قدمی کر رہے ہیں۔ شمالی فن لینڈ میں وہ پت سامو پر قبضہ کر کے ناروے میں داخل ہو گئے ہیں، اور یہاں کرک نس کو جوان کے بیان کے مطابق جرمنی کا ایک بہت اہم بحری مرکز تھا فتح کر لیا ہے۔ لیتویہ میں بھی جرمن پسپا ہوتے رہے ہیں، مگر جو امید بڑی بڑی فوجوں کے گھر جانے کے بعد بھی وہ پوری نہیں ہوئی ہے۔ مشرقی پرشیا میں روسی فوجیں کوئی بیس میل گھس گئیں، اور شروع کے اعلانات سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کونگس برگ میں جا کر دم لیں گی۔ مگر پھر اس کی تفصیل بتائی جانے لگی کہ جرمنوں نے محاذ کے اس حصے میں مدافعت کا کتنا اہتمام کیا ہے اور روسی مشرقی پرشیا کے بجائے وسطی پولینڈ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہنگری میں جو انقلاب ہونے والا تھا وہ دب گیا ہے اور اگرچہ روسی برابر بڑھتے رہتے ہیں، جرمنی ایک صدمہ سے بچ گیا ہے جو اس کے مدافعت کے سامنے نظام کو تہ و بالا کر سکتا تھا۔ یونان کو جرمن خالی کر رہے ہیں، لیکن ان کی پسپائی کی صحیح صورت معلوم نہیں۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بھاری سامان پیچھے چھوڑ کر پیدل بھاگ رہے ہیں، کبھی

یہ خبر آئی ہے کہ سالونیکا سے جرمن فوجیں ریل پر جنوبی یوگوسلاویہ میں کسی مرکز تک پہنچائی گئیں۔ مغربی محاذ پر حالت یہ ہے کہ امریکنوں نے ۲۰ اکتوبر کو آخن فتح کیا تھا، اور اس سے پہلے ہی وہ آخن کے مشرق میں شٹولبرگ پر قبضہ کر چکے تھے۔ اس کے بعد پھر یہاں کی کوئی خبر نہیں آئی، اور اتحادی جرمنوں کو شمالی بلجیم اور جنوب مغربی ہالینڈ سے بیدخل کرنے میں مصروف ہو گئے۔ دراصل یہ ایک ضمنی کارروائی ہے، اتحادی سپہ سالار حملے کے لئے سامان جمع کر رہے ہیں اور اس دوران میں پیش قدمی جاری نہیں رکھی جا سکتی۔ رؤسٹر کے ایک نامہ نگار کا بیان ہے کہ جرمنوں نے اب کئی نئے آلات استعمال کرنا شروع کر دیے ہیں اور اتحادی سپہ سالار اس فکر میں ہیں کہ جنگ کا فیصلہ ہو جائے قبل اس کے یہ نئے آلات بڑے پیمانے پر تیار کئے جا سکیں۔ جرمنوں کے پاس اب پٹرول بہت کم رہ گیا ہے، ہوائی جہازوں توپوں اور ٹینکوں میں وہ اتحادیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان کے لئے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ایسے آلات بنائیں جو سستے اور کارگر ہوں اور جن کے لئے پٹرول درکار نہ ہو اس مسئلہ کا حل انھوں نے سوچ لیا ہے، اب سوال صرف یہ ہے کہ انھیں اپنی تدبیروں پر عمل کرنے کا موقع ملے گا یا نہیں۔ آخن کی سمت میں وہ اپنے آلات کو آزما رہے ہیں، اور انھیں ان آلات کو کافی مقدار میں تیار کرنے کا موقع ملا تو وہ انھیں ہر محاذ پر استعمال کریں گے رؤسٹر کے نامہ نگار کا تو خیال تھا کہ اتحادیوں کے لئے ہر دن نہیں بلکہ ہر منٹ قیمتی ہو گیا ہے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اتحادی جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ انھیں جلد کر لینا چاہیئے ۔ (۲ر نومبر ۱۹۴۴ء)

(ب) ہندوستان

ہندوستان اور تنظیم مابعد جنگ

ہندوستان کے لوگوں کو اب اس بات کا یقین سا ہو گیا ہے کہ موجودہ جنگ میں محوری طاقتیں، متحدہ اقوام کے مقابلہ میں ناکام رہیں گی۔ اس لئے اب انھوں نے جنگ کی خبروں سے دلچسپی ترک کر دی ہے اور اس کی جگہ جنگ کے بعد جو کچھ ہو گا یا جو کچھ ہونا چاہیئے اس کے بارے میں خیال آرائی شروع کر دی ہے حکومت

ہند نے بھی ایک محکمہ اس کام کے لئے قائم کر رکھا ہے لیکن اب اس محکمہ کی اہمیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس کے لئے ایک جداگانہ وزیر کا تقرر عمل میں آیا ہے۔

تنظیم مابعد جنگ کے سلسلہ میں ہندوستان کے اندر جو بے شمار کمیٹیاں، کانفرنسیں، دیگر ادارے اور ماہر افراد کام کر رہے ہیں ان کا جامع اور ہمہ گیر تذکرہ مشکل ہے۔ مرکزی حکومت کے مختلف محکمے، صوبائی حکومتوں کے محکمے، دیسی ریاستیں، صنعتی رہنما، مزدوروں کے رہنما، معاشی ماہر، سائنس کے ماہر——— سب ہی لوگ تنظیم مابعد جنگ کے لئے کوئی نہ کوئی لائحہ عمل یا منصوبہ تیار کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں مسلم لیگ نے بھی اس سلسلہ میں ایک منصوبہ ساز کمیٹی مقرر کی ہے جو اپنا کام کر رہی ہے۔ لیکن جس منصوبہ نے موافقوں اور مخالفوں کو سب سے زیادہ متوجہ کیا ہے وہ وہ ہے جسے ہندوستان کے آٹھ صنعتی رہنماؤں نے تیار کیا ہے۔

اس منصوبہ کا مقصد یہ ہے کہ پندرہ سال کے دوران میں ہندوستان کی سالانہ آمدنی فی کس کو جو جنگ سے قبل کی قیمتوں کے حساب سے برطانوی ہند کے لئے ۶۵ روپے ہوتی تھی بڑھا کر تقریباً دگنا یعنی ۱۳۵ روپیہ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے منصوبہ کے مصنف یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان کی مجموعی سالانہ آمدنی کو تین گنا بڑھایا جائے یعنی ۲۲ ارب روپیہ سالانہ سے ۶۶ ارب روپیہ سالانہ کر دیا جائے۔ آمدنی فی کس کو دگنا کرنے کے لئے مجموعی آمدنی کو سہ گنا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ ہندوستان میں آبادی اوسطاً پچاس لاکھ سالانہ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ اگر آبادی کا اضافہ اسی طرح آئندہ بھی جاری رہے اور ۱۹۴۵ء سے منصوبہ پر عملدرآمد شروع کیا جائے تو پندرہ سال کے خاتمہ پر یعنی ۱۹۶۰ء میں ہندوستان کی آبادی ۹ کروڑ کے بقدر بڑھ جائے گی اور اس نو (۹) کروڑ نئی آبادی کے گذر بسر کا سامان کرنا ضروری ہوگا۔ اس لئے برطانوی ہند اور دیسی ہند کی مجموعی ۴۹ کروڑ آبادی کے لئے ۱۳۵ روپیہ سالانہ فی کس کی آمدنی اس وقت حاصل ہو سکے گی جب مجموعی آمدنی ۶۹-ارب سالانہ ہو جائے گی

منصوبہ کے مصنفوں کا یہ خیال ہے کہ اس ۶۶ ارب سالانہ کی آمدنی کو حاصل کرنے کے لئے ایک کھرب روپیہ کا سرمایہ لگانا ضروری ہوگا اور اسے پندرہ سال کے دوران میں حسب ذیل کاموں

پر خرچ کرنا ہوگا۔

صنعت و حرفت۔ ۴۴ ارب ۸۰ کروڑ روپیہ۔ زراعت ۱۲ ارب ۴۰ کروڑ روپیہ۔ نقل و حمل ۹ ارب ۴۰ کروڑ روپیہ۔ تعلیم ۴ ارب ۹۰ کروڑ روپیہ۔ صحت عامہ ۴ ارب ۵۰ کروڑ روپیہ۔ مکانات ۲۲ ارب روپیہ۔ متفرقات ۲ ارب روپیہ۔ میزان ایک کھرب روپیہ۔

منصوبہ کے مصنفوں نے قومی آمدنی کو ۶۶ ارب تک پہنچانے کے لئے زراعت کی موجودہ پیداوار میں سوا دو گنا، صنعتی پیداوار میں چھ گنا اور خدمات کی پیداوار میں تین گنا اضافہ تجویز کیا ہے۔ اس اضافہ کی نوعیت کا پتہ ذیل کے نقشہ سے چل سکے گا۔

	۱۹۳۱-۳۲ء کی خالص آمدنی	تناسب فیصد	پندرہ برس کے بعد متوقع خالص آمدنی	تناسب فی صد	اضافہ فی صد
صنعت	۳۔ ارب ۴۷ کروڑ	۱۷	۲۲ ارب ۴۰ کروڑ	۳۵	۵۰۰
زراعت	۱۱۔ ارب ۶۶ کروڑ	۵۳	۲۶ ارب ۷۰ کروڑ	۴۰	۱۳۰
خدمات	۴۔ ارب ۸۴ کروڑ	۲۲	۱۴ ارب ۵۰ کروڑ	۲۰	۲۰۰

تناسب فی صدی کے اعداد سے پیشوں کی موجودہ اور متوقع تقسیم کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مصنفوں کا خیال ہے کہ اس نئی تقسیم کے ذریعہ زیادہ متوازن معیشت کا قیام عمل میں آجائے گا۔ صنعتوں میں ابتدائی سالوں میں کلیدی صنعتیں کو ترجیحی حیثیت حاصل ہوگی اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ موجودہ زمانہ میں میکانی قوت اور کیمیاوی اجزا کے بغیر کسی صنعت کا قیام ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح کیمیاوی کھاد کی عدم موجودگی میں زراعت کی ترقی کا تصور بھی دشوار ہے۔ جہازرانی کے معقول انتظامات اور دوسرے ذرائع نقل و حمل کی غیر موجودگی میں، ہندوستان جیسے وسیع ملک کی معاشی زندگی پر ضرور جمود طاری رہے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کلیدی صنعتوں کو جن پر کہ بالآخر ملک کی ساری معاشی ترقی کا انحصار ہے جلد از جلد ترقی دی جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہ سمجھنا چاہئیں کہ فوری استعمال کی چیزوں کی صنعتوں کو نظر انداز کر دیا جائے گا نہیں

ان میں مندرجہ ذیل کو مزید فروغ دیا جائے گا۔

پارچہ بافی (سوتی، ریشمی اور اونی)، شیشہ سازی، چمڑے کی صنعت، کاغذ کی صنعت، تمباکو کی صنعت، تیل کی صنعت وغیرہ۔ چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی کے لئے بھی معقول مواقع فراہم کئے جائیں گے کیونکہ فوری استعمال کی چیزوں میں ان کی موجودگی کافی اہم اور منفعت بخش ہوتی ہے اور اکثر اوقات بڑی صنعتوں کے ساتھ چھوٹی صنعتیں بھی ضروری ہوتی ہیں۔ زراعت وصنعت کیساتھ ساتھ نقل وحمل، صحت عامہ، مکانات وغیرہ کو بھی ترقی دی جائے گی اور ان سب کاموں پر پندرہ سال کے دوران میں ایک کھرب روپیہ کا سرمایہ لگا دیا جائے گا۔

اس سوال کا جواب کہ اس قدر کثیر سرمایہ کہاں سے فراہم ہو منصوبہ کے مصنفوں نے سرمایہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے یعنی اول بیرونی وسائل اور دوسرے اندرونی وسائل۔ بیرونی وسائل سے باہر کے ملکوں کی مشینیں سامان اور خدمتیں خریدنے کا کام لیا جائے گا اور اندرونی وسائل سے ملکی چیزیں اور خدمتیں خریدی جائیں گی ان کی توقع کے مطابق ان وسائل کو پندرہ سال کے دوران میں حسب ذیل طریقے پر حاصل کیا جا سکے گا۔

بیرونی وسائل ۱۔ لوگوں کے پاس دبا ہوا اندوختہ: ۳۔ ارب روپیہ۔ اسٹرلنگ کے تمسکات ۱۰ ارب روپیہ۔ موافق توازن تجارت ۶ ارب روپیہ۔ بیرونی ملکوں سے قرض۔ ۷ ارب روپیہ میزان ۲۶ ارب روپیہ۔

اندرونی وسائل پس اندازی ۴۰ ارب روپیہ تخلیق شدہ زر ۳۴ ارب روپیہ میزان ۷۴ ارب روپیہ

کل میزان ایک کھرب روپیہ

غرض ہندوستان کے صنعتی رہناؤں کے منصوبہ کا خلاصہ یہ ہے جو اوپر درج کیا گیا ہے۔

حکومت ہند نے سرآردشیر دلال کو جو اپنے آپ کو ایک کھرب کے منصوبہ کے ساتھ کھلے طور پر وابستہ کر چکے ہیں منصوبہ سازی کا وزیر بنا لیا ہے اور اس کی پالیسی کمیٹی میں اس منصوبہ کے آٹھ مصنفوں میں سے سات کو شامل کر لیا ہے مرکزی

اسمبلی میں ۳ نومبر ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے سر آردشیر دلال نے کہا ہے کہ حکومت ہند نے بطور ایک عام اصول کے اس منصوبہ کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت ہند نے ہندوستان کے صنعتی رہنماؤں کو امریکہ اور انگلستان جانے کی سہولتیں بھی بہم پہنچائی ہیں تاکہ وہ وہاں کے طریقۂ صنعت کا اپنی آنکھ سے مطالعہ کر سکیں اور وہاں کے صنعتی رہنماؤں سے ملاقات کر کے ذاتی تعلقات قائم کر سکیں۔ مسٹر ایمری وزیر ہند نے بھی ہندوستانیوں کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ برطانیہ کی حکومت ہندوستان کی صنعتی ترقی کی مخالف نہیں ہے۔ سر آردشیر دلال نے جو پالیسی کمیٹی مقرر کی ہے اس میں دیسی ریاستوں کے نمائندوں کو بھی شامل کیا ہے۔ ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے صنعتی رہنماؤں کے ساتھ برطانوی سرمایہ دار سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار ہیں اور ان دونوں کے مفاد میں کوئی ایسا لازمی تضاد نہیں ہے جو کسی طرح بھی دور نہ ہو سکتا ہو۔

ایک کھرب کے منصوبہ کے مصنف ۲۶ ارب روپیہ باہر کے ملکوں میں خرچ کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے امید ہے دس ارب روپیہ اسٹرلنگ کے تمسکات کی صورت میں انگلستان میں موجود ہوگا۔ موافق توازن تجارت سے بھی ۶ ارب روپیہ کی رقم انگلستان میں یا انگلستان کی معرفت حاصل کی جائے گی۔ بیرونی ملکوں سے جو ۷ ارب روپیہ ہندوستان کے اعتبار پر قرض لیا جائے گا اس سے بھی باہمی سمجھوتہ کی صورت میں انگلستان کو فائدہ اٹھانے کا موقع ہوگا۔ غرض انگلستان سے اگر صلح اور دوستی ہو اور انگلستان ٹاٹا برلا کے منصوبہ کو منظور کر لے اور اپنے ملک سے ان مشینوں اور سرمایہ کے دوسرے سامانوں کو جن کی ہندوستان کو ضرورت ہے معقول قیمت پر روانہ کرنے کے لئے راضی ہو جائے تو اس ۲۶ ارب روپیہ کی تقریباً تمام رقم انگلستان سے مال خریدنے پر صرف کی جا سکتی ہے لیکن انگلستان کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا ہوگی کہ اس منصوبہ کے دوران میں ہندوستان انگلستان سے فوری استعمال کی زیادہ چیزیں نہیں خریدے گا۔

یہ بات اگر برطانیہ کے صنعتی رہنماؤں کی سمجھ میں آجاتی اور مندرجہ بالا شرط پر اگر وہ ہندوستان کے صنعتی رہنماؤں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو پھر ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کو بھی اس سمجھوتہ کا ایک فریق بنایا جا سکتا ہے اور ایک ایسی قومی حکومت قائم کی جا سکتی ہے جو اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانا اپنے فرائض میں داخل کر لے۔ اس قومی حکومت کی حمایت کرنے کے لئے کانگریس پارٹی کو تیار کیا جا سکتا ہے اور یہ اگر تیار نہ ہو تو اس کے مقابلہ پر ایک نئی پارٹی قائم کی جا سکتی ہے۔ غرض، اس قسم کا سمجھوتہ اپنے اندر بڑے

زبردست امکانات رکھتا ہے۔

لیکن اگر اس قسم کا کوئی سمجھوتہ نہ کیا گیا تو موجودہ جمود قائم رہے گا۔ جنگ کے بعد جب سپاہی برطرف کئے جائیں گے جنگی صنعتوں میں کام بند ہوگا، ہندوستان کے صناعوں کے مقابلہ میں اپنے کارخانوں کو بند کرنا پڑے گا تو سخت بے روزگاری، کساد بازاری انتشار اور پریشان حالی پیدا ہوگی۔ غیر مطمئن سیاسی جماعتوں کو اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا خوب موقع ملے گا بائی کاٹ کی تحریکیں چلیں گی اور معلوم نہیں کیا کیا خرابیاں پیدا ہوں گی۔

اس لئے ایک طرف اشتراک عمل، ترقی اور باہمی فائدہ کا راستہ ہے اور دوسری طرف عدم تعاون، جمود اور خود غرضی کا راستہ ہے ان دونوں میں سے کسی ایک کو برطانیہ کے سرمایہ داروں اور حکمرانوں کو انتخاب کرنا ہے۔

مزدوروں کا طبقہ اور ان کی تحریکیں ابھی تک غیر منظم حالت میں ہیں۔ برطانیہ کے سرمایہ داروں اور ہندوستان کے سرمایہ داروں اور دیسی حکمرانوں کے درمیان اگر سمجھوتہ ہوگیا تو آئندہ بھی انھیں زیادہ ابھرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ لیکن اگر یہ سمجھوتہ نہ ہوا اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے موقع پر ان کو ایک دوسرے کے خلاف اکسایا تو وہ منظم اور مضبوط ہوتے چلے جائیں گے اور بعد میں سب کے لئے ایک آفت جان اور بلائے بے درماں بن جائیں گے۔

مسلمانوں کا معاملہ بھی مزدوروں کے طبقہ ہی سے مشابہ ہے اگر برطانیہ کے سرمایہ داروں اور ہندوستان کے سرمایہ داروں میں اتحاد ہوگیا تو مسلم لیگ کی پاکستان کی تحریک خلافت، کی تحریک کی طرح بیٹھ جائے گی کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی ٹٹ پونجیا جماعت کے لئے ان دیو زاد سرمایہ داروں کا مقابلہ کرنا ناممکن ہو جائے گا ایک طرف کے منصوبہ کو نافذ کرنے والی جماعت کے ہاتھ میں، سرمایہ، سرپرستی، پرورش، ترغیب و تحریص اور زور و زبردستی کے بہت سے ہتھیار ہوں گے اور اس وقت حالت بالکل وہ ہو جائے گی جو ہندوستان کی موجودہ جنگ میں شرکت کی ہے کہ اس کی مخالفت ہندوستان کی قومی جماعت کانگریس نے کی، مسلم لیگ نے اس کی موافقت نہیں کی۔ لیکن سرکار کے کاموں میں اس کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ میدانی، ہوائی

اور بحری افواج میں رنگروٹ برابر بھرتی ہوتے رہے۔ جنگی صنعتوں میں ماہر اور غیر ماہر مزدوروں کی فراہمی میں کوئی وقت پیش نہیں آئی جنگ کے لئے مال تیار کرنے سے کسی سرمایا دار نے انکار نہیں کیا بلکہ اپنی سرگرمی اور مستعدی دکھانے میں حریفوں اور لالچیوں کا ڈھنگ اختیار کیا۔ سرکاری ٹھیکوں کے ذریعہ خوب دولت اکٹھی کی گئی۔ یہی حال ہمارے روشن خیال اور سیاسی شعور رکھنے والے لوگوں کا تھا۔ عوامی محاذ جنگ، محکمہ اطلاعات آل انڈیا ریڈیو، سپلائی کے محکمے اور دوسرے جنگی محکموں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ بکثرت بھرتی ہوتے رہے۔ کانگریس کی ہمدردی میں چند دنوں کے لئے ضرور گڑبڑ ہوئی لیکن وہ زیادہ دیرپا اور وسیع الاثر ثابت نہیں ہوئی۔ کچھ ہزار آدمی جیلوں اور نظربندوں کے کیمپ میں پہنچا دیئے گئے پھر تمام کام اطمینان اور عافیت سے کئے جانے لگے یہ بات تلخ اور ناگوار ضرور ہے لیکن ہے حقیقت اور اس سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ ہماری نہایت پرشور اور ہنگامہ خیز تحریکوں کی بساط کیا ہے اور اس بات کا سبق ملتا ہے کہ ان معاملات میں توازن دماغی کو قائم رکھنے کی بہت سخت ضرورت ہے اور سیاسی پارٹیوں کو ہر طرح کے اتار چڑھاؤ کے لئے برابر تیار رہنا چاہیئے۔

بہرحال اس قسم کا سمجھوتہ اگر ہوگیا تو وہ پاکستان کے لئے موافق ثابت نہ ہوگا اور یہ مسلم لیگ کے لئے بڑی آزمائش کا وقت ہوگا۔ اس قسم کے امکان کو مسلم لیگ کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

چند منتخب کتابیں

اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات وغیرہ

مبادی سیاسیات	محمد ہارون خاں صاحب شروانی	شے
مالیات عامہ	جے، سی، کماریا	عہ ر
نہرو رپورٹ مکمل	نہرو کمیٹی	عہ ر
یورپ کی حکومتیں	ڈاکٹر جعفری	عہ ر
مسلمانوں کا روشن مستقبل	مولوی طفیل احمد	صر
اجتماعی زندگی کی ابتدار	پروفیسر محمد عاقل	۱۲ ر
ہندوستان کا دیہی قرض	" " "	۶ ر
مسئلہ آبادی	" " "	۶ ر
دیہی صنعتیں	جے، سی، کماریا	۶ ر
ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ	ڈاکٹر زین العابدین	۶ ر
ہندوستان میں برطانوی حکومت	" "	۱۲ ر
انگلستان کا طریقہ حکومت	شانتی سروپ شاستری	۶ ر
ناموران سیاست	عبد المجیب محمد نسیم	۸ ر
بحرالکاہل کی سیاست	امین خالدی	عہ ر
اسلامی ممالک کی سیاست	عشرت علی صدیقی	عہ ر
اتحاد کا پیغام	کمیونسٹ پارٹی	۶ ر
انقلاب ۱۸۵۷ء	شیخ حسام الدین بی اے	عہ
انقلاب فرانس	بارٹی	۱۲ ر
انگریزی حکومت اور عراق	مرتبہ مشتاق احمد	۴ ر

اشتراکی روس	عبد القادر لکچرار	۶ ر
بیان ابوالکلام آزاد	مولانا آزاد	۴ ر
بیان مولانا حسین احمد مدنی	مولانا حسین احمد	۲ ر
بیان مولانا محمد علی	مولانا محمد علی	۴ ر
پاکستان اور ہندوستان	سید عبد القدوس ہاشمی	عہ ر
تازہ مضامین ابوالکلام	ابوالکلام آزاد	۱۰ ر
ترک موالات	شیخ الہند	۱ ر
تقاریر مولانا محمد علی	مولانا محمد علی	۸ ر
" ظفر علی خاں	ظفر علی خان	۵ ر
" جناح	عثمان صحرائی	عہ ر
جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی	شیخ رحمٰن بخش بی اے	عہ ر
حوادث سمرنا	ابوالاعلیٰ مودودی	۸ ر
خطوط جیل علی برادران	مولانا محمد علی و شوکت علی	۵ ر
خطبہ صدارت جلسہ آگرہ	مولانا ابوالکلام آزاد	۹ ر
خطبہ صدارت سی آر داس	سی، آر، داس	۶ ر
خطبہ صدارت	مولانا عبد الباری	۲ ر
خطبہ صدارت کوکناڈا	مولانا محمد علی	عہ ر
" " لکھنو	" "	۱۰ ر
" مسیح الملک	حکیم محمد اجمل خان	۴ ر

خلافت اور انگلستان	ڈاکٹر سید محمود پی ایچ ڈی	عہ	مرقع اجتماعات احمد آباد	زاہد نعمانی قادری	۱۰ر
دنیائے اسلام اور خلافت	مولانا سید سلیمان ندوی	۲ر	مشرق بعید	شاہد رزاقی	عہر
سوویٹ روس کی آزاد قومیں	سجاد ظہیر	۶ر	معاشیات پاکستان	عبدالقدوس ہاشمی	عہر
شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک	مولانا عبیداللہ سندھی	۱۲ر	شلر کیا چاہتا ہے	مطبوعہ لاجپت رائے اینڈ سنز	۱۲ر
			ہم سوراج کیوں چاہتے ہیں	"	۵ر
علمائے کرام کا مستقبل	مظفر الدین صدیقی بی اے	۸ر	ہندو مسلمان یا سیاسی پیشین گوئی	منشی مشتاق احمد صاحب میرٹھ	۴ر
غذا کا سوال	رندیوے	۲ر	ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی	کمیونسٹ پارٹی	۴ر
غذا کیسے ملے	ایس۔ جی۔ سردیسائی	۱۲ر	امریکہ اور بین الاقوامی زر کے منصوبے	عطاء الرحمن بی اے جامعہ عثمانیہ	۲ر
فصل الخطاب	مرتبہ سنٹرل خلافت کمیٹی	ار	انگلستان اور بین الاقوامی۔۔	اے جے محمد شمس الدین بی اے	۸ر
قول فیصل	ابوالکلام آزاد	عہ	جنگ اور روپیہ	امتیاز حسین خاں بی کام لندن	۱۲ر
کراچی کا تاریخی مقدمہ مکمل	مرتبہ مرزا عبدالقادر بیگ ایم اے	للعہ	جنگ اور غذا	ڈاکٹر احمد اقبال قریشی	۱۱ر
کشف حقیقت مالابار	مولانا عبدالماجد صاحب ندوی	۸ر	جنگ اور [illegible] کا مسئلہ	شفیق الرحمن عثمانیہ	۱۲ر
کلمہ حق	معین الدین اجمیری	۸ر	ہندوستان کے زر پر جنگ کے اثرات	محمد احمد خاں بی اے	عہر
گاندھی نے فاقہ کیوں کیا	مرتبہ سید عبداللہ	۲ر	ہندوستان کا قومی قرضہ	"	۱۲ر
مالابار موپلا	مولانا آزاد سبحانی	۲ر	سوراج	مولانا آزاد سبحانی	۵ر

تعلیم

ہم کیسے پڑھائیں	سلامت اللہ صاحب ایم اے علیگ	عہ	اسلامی تہذیب اور قومی تعلیم	ڈاکٹر سر پی سی رائے	۴ر
لیونارڈو گرٹروڈ	جوہان ہنرچ پستالوزی	عہ	حرف کا قاعدہ	عبدالغفار صاحب مدہولی	۴ر
اونٹنا دھنا	سیتن	عہ	بچوں کا قاعدہ	"	۴
میلا والیکی پروجیکٹ	عبدالغفار صاحب مدہولی	۵ر	مشق خوش نویسی	منشی علی محمد خاں صاحب	۲ر
اردو پڑھانے کا طریقہ	"	۴ر	آسان املا	فیاض حسین صاحب	۴ر
رہنمائے قاعدہ	"	۴ر	آسان خوش خطی حصہ اول	"	۳ر
مدرس کا قاعدہ نما	صاحبزادہ سعید الظفر خاں	۴ر	نظم ونسق مدرسہ	خانصاحب سید محمد شاہ ولیمنی	عہر
مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ	ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب	۸ر	دیہات میں تعلیم	عبدالشکور صاحب	عہر

تاریخ

کتاب	مصنف	قیمت
جگ بیتی	پنڈت جواہر لال نہرو	صہ
دنیا کی کہانی	پروفیسر محمد مجیب صاحب	۸/
دلی کی دو سو برس کی تاریخ	مولوی سید حسن برنی	۲/
تاریخ ہند کی تمہید	پروفیسر محمد مجیب صاحب	۲/
تاریخ ہند قدیم	ایم پانیکر صاحب	عہ
ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش	خالدہ خانم	سے/
مغلوں کا مد و جزر	خواجہ محمد شفیع	۲/
تاریخ مغربی یورپ	ڈاکٹر رابن سن	عالہ
صحیفۂ چین	کنفیوشس	عالہ
تاریخ الامت حصہ اول	مولانا اسلم جیراجپوری	عالہ
" " " دوم	" "	۸/
" " " سوم	" "	عالہ
" " " چہارم	" "	عالہ
" " (دو حصہ) پنجم	" "	عہ
" " " ششم	" "	عالہ
" " " ہفتم	" "	عالہ
تاریخ الامت حصہ ہشتم	مولانا اسلم جیراجپوری	عالہ
المدینۃ فی الاسلام	علامہ محمد فرید وجدی	عالہ
انقلاب فرانس	مولوی عبد القادر صاحب بی اے	۸/
تاریخ تبت مغربی	محمد عبد الستار لداخی	۲/
جشن فیروزی	خواجہ محمد عباد اللہ اختر	۸/
دربار اکبری	مولانا محمد حسین آزاد	سے/
سیر ایران		عہ
رحلت خلفائے راشدین	ملیح آبادی	۸/
مضامین یونانی مظالم	سید ابو الاعلیٰ مودودی	عہ
شہید کربلا مختلف مضامین	ابو الکلام حسن نظامی وغیرہ	۱ہ
مرقع اودھ	محمد احمد علی صاحب بی اے	۸/
مسلمانوں کا عروج اور زوال	سعید احمد ایم اے	عہ
تذکرہ شاہ طہماسپ	شاہ طہماسپ صفوی	عہ
سفرنامہ عراق	شاہ حسین میاں صاحب	۲/
سیر اندلس	عبد الوہاب صاحب وکیل	۹/
آج کا مصر	پروفیسر محمد حسن الاعظمی	عالہ

سیرة

کتاب	مصنف	قیمت
میلاد النبی	مولانا ابو الفرج جمال الدین جوزی	عالہ
ذکر حبیب	حبیب الرحمٰن خاں شیروانی	۲/
رؤف الرحیم	مولوی حافظ محمد حمید اللہ صاحب ماہر	عالہ
تواریخ حبیب الٰہ	مطبوعہ شیخ الٰہی بخش محمد جلال الدین	۲/
شجاعت نبوی	مولانا عبد الوہاب صاحب عندلیب	۱ہ

سوانح

کتاب	مصنف	قیمت
ستالن	مترجمہ مسٹر آصف علی بیرسٹر	للعہ
ناموران اسلام	محمد حسین حسان ندوی	سے/
ضیاء الدین برنی	سید حسن برنی ایم اے	۱ہ

تذکرۂ علماء	مولانا آزاد	۵ر
حالات علی برادران	حافظ عزیز الرحمن بقائی	۸ر
حیات حافظ رحمت خاں	سید الطاف علی صاحب بی اے علیگ	عہ
حیات سلطانی	محمد امین زبیری	[illegible]
حیات کامل	مظہر الدین شیرکوٹی ایڈیٹر الامان	عہ
حیات محسن	مولوی محمد امین زبیری	[illegible]
حیدر علی	محمود خاں محمود	۱۲ر
حیات غوثیہ	مقبول احمد نظامی	۲ر
خونی شہادت کے دو قطرے	ابو الکلام آزاد	۴ر
ذکر خواجہ	مقبول احمد سیوہاروی	۸ر
سفر اودھ	مولوی مسیح الدین علوی خاں	[illegible]
علامہ سیتاپوری	ڈاکٹر سید نادم	۴ر
غلام ہمدانی مصحفی	مولانا عارف ہسوی	۴ر
غلامان اسلام	مولانا سید احمد ایم اے	عہ
قرۃ العین	عبد الحلیم شرر	۴ر
کمال اتاترک	کے اے حمید بی اے	۱۰ر
گوتم بدھ	منشی امیر احمد علوی	۴ر
لسان الامت	عبد الرحمن صدیقی بی اے	۱۲ر
لینن	خلیق احمد نقوی	۸ر
مسولینی کی آپ بیتی	مسولینی	[illegible]
مولانا حیدر حسن خاں	رئیس احمد جعفری ندوی	۸ر
مینزنی	لالہ لاجپت رائے	عہ
نگارستان فارس	مولانا محمد حسین آزاد	[illegible]
وقار حیات	وقار الملک کی مشہور سوانح حیات	[illegible]
ہندوستان کی مشہور ہستیاں	نقاش فطرت	۶ر
یادگار حشر	جمیل احمد کندھاپوری	[illegible]

ادب

مضامین محمد علی حصہ دوم	مرتبہ پروفیسر محمد سرور صاحب	للعہ
انشار	فرحت اللہ بیگ دہلوی	۱۲ر
باقیات بجنوری	ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری مرحوم	للعہ
حیات حافظ	مولانا محمد اسلم جیراجپوری	عہ
حیات جامی	"	عہ
بڑھاپے کی برکتیں	خواجہ عبد المجید دہلوی	عہ
رفتار زمانہ	"	۸ر
ادبی مقالات		[illegible]
ادبیات ایران نو	محمد طاہر فاروقی	[illegible]
اردو ادب جنگ عظیم کے بعد	ڈاکٹر سید عبد اللہ ڈی لٹ	۱۲ر
داستان تاریخ ریختہ	خواجہ عبد المجید دہلوی	۸ر
ترقی زبان اردو	پروفیسر بی گموشال ایم اے	۴ر
انتخاب غالب	محمد عبد الرزاق ایچ سی ایس	[illegible]
پنکھڑیاں	حکیم محمد یوسف حسن خاں	۸ر
سرسید کی دینی برکتیں	مولوی عبد الحلیم صاحب	۲ر
گلدستہ مضامین انشاپردازی	مصنفہ رمضان علی ایم اے	[illegible]
مضامین فرحت حصہ اول	فرحت اللہ بیگ دہلوی	[illegible]
محشر خیال	سجاد انصاری مرحوم	[illegible]
اقبال کا مطالعہ	سید نذیر نیازی	[illegible]
اقبال کا تصور زمان و مکان	ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	[illegible]

اقبال کے چند جواہر ریزے	پروفیسر خواجہ عبدالحمید	۱۰ار	غنچۂ تبسم	سید تمکین کاظمی	عار
خطوط شبلی	مرتبہ محمد امین زبیری	عہ	گلابی اُردو	ملا رموزی	عہ
اُردوئے معلّٰی	مرزا غالب	ے	خطوط ملا رموزی	”	عہ

نظم

شعلۂ طور	جگر مرادآبادی	عہ	مسدس حالی صدی ایڈیشن	مولانا الطاف حسین حالی	عہ
دیوانِ غالب جرمنی		للعہ	جذبات صغیر	صغیر احمد جان ایم اے	عہ
سبد چین (غالب)	انتخاب فارسی کلام	ع	خمخانۂ رام	سوامی رام تیرتھ	عار
دیوان شیدا	حکیم اجمل خاں شیدا	عا	خمکدۂ آزاد	مولانا محمد حسین آزاد	۱۲ار
مناظر قدرت جلد دوم	مرتبہ الیاس برنی	عا	خورشید اور بدر	مولوی نور الحسن نیّر	ار
آتش خاموش	احسان دانش	عا	دیوان ذوق مع قصائد	ذوق	سر۔ عار
جادۂ نو	”	۱۲ار	ذکر محمود	احمد علی خاں احمد قریشی	۲ر
نفیر فطرت	”	عا	سنگ وخشت	احمق پھپھوندوی	للعہ
افکار سلیم	وحید الدین سلیم	ے	صبح حرم	محمد ابو شرف مجددی	۱۰ار
بلال	ڈاکٹر اقبال	ار	قاسم و زہرہ	منشی احمد علی شوق قدوائی	۸ر
تصویر درد	”	۲ر	قصائد ذوق	مرتبہ ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان	عہ
جذبات حریت	”	۸ر	قطعات خواجہ	خواجہ عبدالمجید دہلوی	ار
بہار جاوداں	دلی وارثی وصابر خلیلی	سے	کسان رُت	سید مطلبی (منظوم ڈراما)	عہ
بہار داغ	داغ دہلوی (مرتبہ نذیر بنارسی)	عا	کلام مشیر	مشیر حسین قدوائی	عہ
پیام شباب	قاضی نذر الاسلام کی نظموں کا ترجمہ	عہ	نامہ مشیر	” ” ”	۸ر
تخمیس	محسن کاکوروی و مولانا حالی	ہر	نالہ مشیر	” ” ”	عہ
حب کی داد	مولانا حالی	۲ر	مادر ہند	شاد عظیم آبادی	۱۲ر
حب وطن	” ”	۲ر	مثنوی گلزار نسیم	مرتبہ ابو النعیم عبدالحکیم	۸ر
مجموعۂ نظم حالی	” ”	۱۰ار	مجموعۂ نظم شبلی	مولانا شبلی	۸ر

منتخب نظمیں	ادارۂ ادب لطیف	۸ر	نقوش مانی	مانی جائسی	عہ
منتخبات کلام ہندی	ڈاکٹر جعفر حسن	[illegible]	نگارستان	مولانا ظفر علی خاں	[illegible]
منزل	علی سردار جعفری۔ جدید شاعری	۱۲ر	نیک بی بی	مولانا ذہین	۴ر
نقار لق لق	حاجی لق لق (مزاحیہ)	عہ	وجدانیات فانی	فانی	[illegible]
نقش فریادی	فیض جدید اردو شاعری	[illegible]	انتخابات مثنویات میر	سر شاہ سلیمان	[illegible]

ناول و افسانے

میدان عمل	منشی پریم چند	[illegible]	سیل حوادث	مولوی سید نور الحسن بی اے	عہ
خیالستان	سید سجاد حیدر یلدرم	[illegible]	عورت کی محبت	سدرشن	[illegible]
کیمیاگر	پروفیسر محمد مجیب	[illegible]	گناہ کی بیٹی	"	۱۲ر
زہرا	سجاد حیدر یلدرم	۱۰ر	فطرتی جاسوس	مرزا فدا علی خنجر	[illegible]
آسیب الفت	" "	۱۲ر	یلی فرنگ	میر محمد حسن	۱۴ر
میونسپل الیکشن	خواجہ محمد شفیع	[illegible]	آخری تحفہ	منشی پریم چند	[illegible]
بنی اسرائیل کا چاند	رائڈر ہیگرڈ	[illegible]	آغاز و انجام	جمیل احمد کندھاپوری	[illegible]
نیرنگ	ایس۔ آر۔ کے	[illegible]	طلوع و غروب	" "	[illegible]
آزادی ہند	چودھری افضل حق	[illegible]	آہیں	طفیل ملک	[illegible]
آشرم	ایم اسلم	[illegible]	پتھروں کا سوداگر	سدرشن	۱۲ر
انقلاب فرانس	عبدالرزاق	۱۲ر	خوش انجام	"	۶ر
بڑی دیدی	شرت چند چٹرجی	[illegible]	سونسنگار	"	[illegible]
دیوداس	" "	عہ	سدا بہار پھول	"	عہ
پریم پجارن	فردوس صہبائی ایم اے	[illegible]	ڈاچی	اوپندر ناتھ اشک	[illegible]
رقاصہ	ایم اسلم	[illegible]	روحی فداک	خلیل آفندی	۸ر
روٹھی رانی	منشی پریم چند	[illegible]	تلاش راز	نیاز فتح پوری	۱۲ر
ساز شکستہ	رشید اختر ندوی	[illegible]	حکایات شرلک ہومز	منشی یعقوب خاں	عہ

حکایات لیلیٰ مجنوں	سجاد حیدر یلدرم	۱ر	عورت کا گناہ	فارغ بخاری	عار
خاموش حسن	ٹیگور	۸ر	غریب کی آہ	روشن بی۔اے	عہ
سرگذشت اسیر	وکٹر ہیوگو	عہ	ساز ذات	سلطان حیدر جوش	ار
شہزادے	ڈاکٹر سیتاپوری	عہ	مشاہیر کے رومان	عبدالرحیم شبلی بی کام	۸ر
شوکیہ اور مظلوم بہن	محمد یوسف	۱ہر	ہوائی قلعے	کرشن چندر ایم۔اے	عہ
صدائے جرس	مسز عبدالقادر	عہ	آنسو	سرت چندر چٹرجی	عہ

ڈرامے

ایک ایکٹ کے ڈرامے	علی عباس حسینی	عہ	آغاز ہستی	مجنوں گورکھپوری	۱۲ر
انجام	پروفیسر محمد مجیب	۸ر	ایک معمولی عورت	آسکر وائلڈ	عہ
ہمزاد	پروفیسر اشتیاق حسین	۶ر	جمہوریت و آمریت	سید نصیر احمد بی۔اے	عہ
نفرت کا بیج	" " "	۸ر	حشرات الارض	محمد فضل الرحمٰن	عہ
بت تراش	" " "	۱ہر	ڈرامہ اکبر	مولانا محمد حسین آزاد	عہ
بند لفافہ	" " "	۱ہر	روح سیاست	نور الٰہی، محمد عمر	۸ر
ملا اعلیٰ	" " "	۱ہر	گناہ	خواجہ محمد شفیع دہلوی	عہ
مٹھائی کی ٹوکری	" " "	۱ہر	مرمر اور خون	عزیز احمد بی۔اے	عہ
کٹھ پتلیاں	" " "	۸ر	مصنوعی شوہر	قاضی شفیع الزماں	۲ر
بیمار	سجاد ظہیر	۱ہر	سیکفرون اور لوسی	منشی احمد علی شوق قدوائی	۲ر

مذہب

حمائل شریف	(فاطمۃ الکبریٰ)	للعہ	تفسیر سورۂ آل عمران	مولانا خواجہ محمد عبدالحی	۱عہ
" "	(جرمنی)	عہ	" " حجرات	" " "	۱ر
تاریخ القرآن	مولانا محمد اسلم جیراجپوری	عہ	" " کوثر	" " "	عہ

تفسیر پارہ عمّ ۲	مولانا خواجہ عبدالحی	۱۲/
بصائر	بنی اسرائیل کے واقعات و حوادث	۸/
اسلام اور موجودہ مدنی مسائل	مولانا عبدالرؤف دانا پوری	۸/
محجوب الارث	مولانا محمد اسلم جیراجپوری	۸/
الوراثۃ فی الاسلام	" " "	۸/
مذہب و تمدن	مولانا ابوالحسن علی	۱۲/
اقل قلیل اسلام	قاضی سرفراز حسین صاحب	۲/
احیائے ملت	" " "	۸/

اسلام	نواب محسن الملک	۶/
اسلام اور آریہ سماج	مقبول احمد سیوہاروی	۶/
اصل مالا بدمنہ (اردو)	مطبوعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ	۱۲/
تنقیح العبادت	مولانا سید آل حسن رضوی	۳/
ترتیب نزول قرآن	علامہ پروفیسر محمد اجمل خاں	۱۲/
جزاء الاعمال	مولانا اشرف علی صاحب	۳/
حقائق اسلام	ڈاکٹر آر ڈی خاں	۱/
مسئلہ جبر و قدر	سید ابوالاعلیٰ مودودی	عہ/

متفرقات

اسلامی کتب خانے	قاضی احمد میاں اختر	۱/
انیس الغربا	قاضی سرفراز حسین	۱/
فغان قاری	" " "	۱/
تجدید عمل مکمل	مرزا عسکری علی خاں مجازی	عہ
تہذیب عمل	نسیم رضوانی	۶/
تیسیر النحو	مولفہ محمد مسلم	۸/
حسنیہ (صرف و نحو)	مولوی عباس علی مرحوم	۸/
شناخت خطا ابہام	مرزا رفیق بیگ	عار
عقیدت الحسنہ	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	۲/
علم ہندسہ جدید (جامیٹری)	ایم ایس ہال	۲/
علم ہندسہ جدید مکمل	" " "	۱/

قند پارسی	مولانا محمد حسین آزاد	۱۰/
کلید عربی	قاضی خلیل احمد	۳/
لغت آزاد	مولانا آزاد	عہ
لیلۃ القدر	ابوالکلام آزاد	۱/
مرآۃ الغالب شرح دیوان غالب	بیخود	۱۲/
مشاہدات عالم	چندی پرشاد بی اے ال ال بی	عہ
مقصود حیات	حافظ وکیل احمد غازی پوری	۹/
منتخبات اردو	سید ابوظفر ندوی	۱/
نیرنگ خیال پکچر البم مکمل	از نیرنگ خیال	عار
ہندو تہواروں کی اصلیت	منشی رام پرشاد بی اے	۹/
آئین جمہوریت	آصف علی بیرسٹر	۱/

اس مہینے کی نئی کتاب

تاریخ الامّت حصہ ہشتم

قرآن و تاریخ اسلام

اس آٹھویں حصے میں پوری اسلامی تاریخ پر قرآنی زاویۂ نگاہ سے تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اور یہ دکھایا گیا ہے کہ کہاں کہاں ملت نے قرآن کے خلاف راہ اختیار کی جن کے نتائج اب بھگت رہی ہے۔ اس میں ضمناً خوارج، شیعہ، معتزلہ اور مرجیہ فرقوں کی بھی تاریخ آگئی ہے۔ آخر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اُمت کو اس تنزل سے نکال کر پھر عروج پر پہنچانے کا کیا سامان دینِ اسلام نے کیا ہے۔ قیمت عمر

مکتبہ جامعہ دہلی، نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

چند ادبی کتابیں

دیوان غالب جدید مع مقدمہ بجنوری مرحوم ۔ غالب کا مکمل دیوان، جو مدت سے گوشہ گمنامی میں پڑا ہوا تھا قیمت مجلد ۳/ـ

گفتار بیخود ۔ جانشین داغ حضرت بیخود دہلوی کے کلام کا مکمل مجموعہ ۔ " " ۳/ـ

دیوان ثاقب ۔ مرزا ثاقب لکھنوی کا دیوان ۔ میر کی زبان اور غالب کی تخیل دیکھنی ہو تو اس دیوان کو ملاحظہ فرمائیے ۔ " " ۲/۸

مرآۃ الشعر ۔ از شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن ۔ عربی، فارسی اور اردو پر مفصل اور مبسوط بحث ۔ " ۳/ـ

محشر خیال ۔ فلسفہ اور ادب لطیف کا ایک حیرت انگیز امتزاج اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر اور اقبال کی نظم کی خصوصیات کا حامل ۔ قسم اول ۱۲/ قسم دوم ۱/ـ سوم ۲/۸

باقیات بجنوری ۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مضامین کا مجموعہ اور دور جدید کی ادبی تحریکوں کا سرچشمہ ۔ ۱/۱۲

انشاء ۔ آسمان شاعری کے درخشاں ستارہ، انشاء اللہ خاں پر ایک تنقیدی نظر ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے قلم سے ۔ ۱۲/

قول فیصل ۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت اور انشاء پردازی کا بہترین نمونہ ۔ ۸/

بڑھاپے کی برکتیں ۔ از خواجہ عبدالمجید دہلوی ۔ دلی کی ٹکسالی زبان کا ایک اچھا نمونہ ۔ مجلد ۱/۸

بنی اسرائیل کا چاند ۔ سر رائڈر ہیگرڈ کے ایک مشہور تاریخی ناول کا ترجمہ ۔ " ۳/ـ

خیالستان ۔ سید سجاد حیدر یلدرم کے مختصر افسانوں اور مضامین کا مجموعہ " ۳/ـ

آسیب الفت ۔ مترجمہ سید سجاد حیدر یلدرم ایک ترکی افسانہ کا ترجمہ ۔ " ۱۲/

ہوائی قلعے ۔ مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے لطیف اور شستہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ۔ " ۱/۱۲

ایک ایکٹ کے ڈرامے ۔ مشہور ادیب علی عباس حسینی کے نو مختصر ڈراموں کا مجموعہ ۔ " ۲/۸

نگارستان ۔ مولانا ظفر علی خاں کی نظموں کا مجموعہ ۔ " ۱/۱۲

نقش فریادی ۔ ایک ایسے شاعر کا مجموعہ کلام جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے یعنی فیض احمد فیض ۔ " ۱/۱۲

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ، دہلی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۲



مکتبہ جامعہ دہلی

چند تاریخی کتابیں

جگ بیتی	پنڈت جواہر لال نہرو	صر	تاریخ الامت حصہ ششم	مولانا اسلم جیراجپوری	عاہر
دنیا کی کہانی	پروفیسر محمد مجیب	۱۲ر	المدنیۃ والاسلام	علامہ محمد فرید وجدی	۱۲ر
دلی کی دو سو برس کی تاریخ	مولوی سید حسن برنی	۲ر	انقلاب فرانس	مولوی عبدالقادر بی اے	عہ
تاریخ ہند کی تمہید	پروفیسر محمد مجیب	۲ر	تاریخ تبت مغربی	محمد عبدالستار لداخی	۲ر
تاریخ ہند قدیم	ایم پانکر	۲عہ	جشن فیروزی	محمد عباد اللہ اختر	۸ر
ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش	خالدہ خانم	سے	دربار اکبری	مولانا محمد حسین آزاد	۱۲
مغلوں کا مد و جزر	خواجہ محمد شفیع	۲ر	سیر ایران	〃 〃 〃	عہ
تاریخ مغربی یورپ	ڈاکٹر رابن سن	۱۲	رحلت خلفاء راشدین	ملیح آبادی	۸ر
صحیفہ چین	کنفیوشس	۱۲	سمرنا میں یونانی مظالم	سید ابوالاعلیٰ مودودی	عہ
تاریخ الامت حصہ اول	مولانا اسلم جیراجپوری	عہ	شہید کربلا و مختلف مضامین	ابوالکلام حسن نظامی وغیرہ	۲ر
〃 〃 دوم	〃 〃 〃	۱۲	مرقع اودھ	محمد احمد علی بی اے	۲ر
〃 〃 سوم	〃 〃 〃	۱۲	مسلمانوں کا عروج اور زوال	سعید احمد ایم اے	۱۲
〃 〃 چہارم		۱۲	تذکرہ شاہ طہماسپ	شاہ طہماسپ صفوی	عہ
〃 خورد پنجم		عہ	سفرنامہ عراق	شاہ حسین میاں	۲ر
〃 〃 ششم		۱۲	سیر اندلس	عبدالوہاب وکیل	۹ر
〃 〃 ہفتم		عہ	آج کا مصر	پروفیسر محمد حسن الاعظمی	۱۲

مکتبہ جامعہ دہلی
دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

جامعہ

مدیر ادارت: پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۴ نمبر ۳ | بابتہ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۴ء | سالانہ چندہ ۵ر فی پرچہ ۸ر

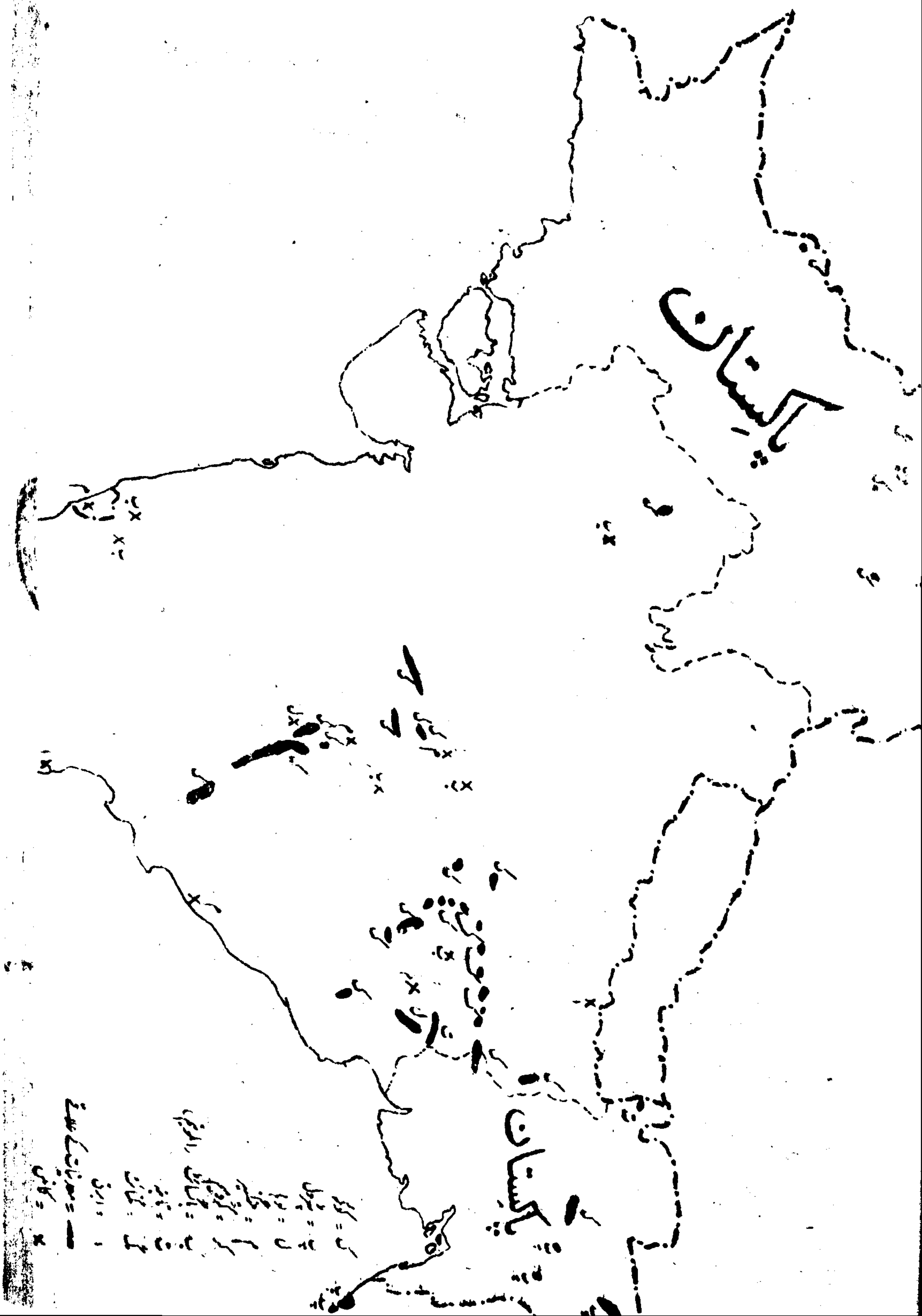
فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے آکسن محبوب المطابع پریس دہلی

پاکستان اور ہندوستان کے معدنی وسائل دولت

ذیل میں ہم کولمبیا یونیورسٹی کے ماہر ارضیات، پروفیسر چارلس ایچ بہرے کی ایک رپورٹ کے اقتباسات کو ترجمہ کرکے پیش کر رہے ہیں۔ یہ رپورٹ امریکہ کے مشہور سہ ماہی رسالہ "فارین افیرس" کے اکتوبر ۱۹۴۳ء کے پرچے میں شائع ہوئی تھی اس میں جو واقعات اور خیالات ہیں وہ نہایت عالمانہ، منصفانہ اور ہمدردانہ انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ بہ ظاہر پروفیسر بہرے کو ہندوؤں کی طرف داری کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اس لئے انھوں نے جو کچھ مشورہ دیا ہے وہ خلوص اور نیک نیتی پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور اس بنا پر ہمارے انتہائی غور اور توجہ کا مستحق ہے۔ پاکستان کا معاملہ ہندوؤں سے طے کرتے وقت ہمیں اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو جذبات سے خالی ہو کر سوچ سمجھ لینا چاہئے اور ضروری ماہرانہ مشوروں کو بھی حاصل کرلینا چاہئے۔ تاکہ بعد میں ہمیں پچھتانا اور تکلیف نہ اٹھانا پڑے ہم ملک کے صاحب فکر بصیرت اصحاب کو عام دعوت دیتے ہیں کہ وہ جامعہ کے صفحات کے ذریعے اس مسئلے پر اپنے گراں بہا خیالات پیش فرمائیں۔ (مدیر)

برما کے سلطنت ہند سے علیحدہ ہو جانے کے باوجود بھی اس ملک کا درجہ، دنیا کی تجارت میں مندرجہ ذیل معدنی اشیاء کے فراہم کرنے والے ملک کی حیثیت سے یا تو فی الحال اہم ہے یا اس کے اہم ہو جانے کی امید ہے: کوئلہ اور پٹرول، لوہا، مینگنیز، اور کروم کی کچ دھاتیں، سونا، باکسائیٹ میگنسائٹ ابرک، جپسم، مختلف بیش قیمت پتھر، مونازائیٹ اور بعض دیر میں پگھلنے والی چیزیں۔ ان کے خاص ذخیرے یا کانیں سلطنت ہند میں کس کس جگہ ہیں ان کو ساتھ کے نقشے میں مناسب



نشانوں کے ذریعے سے دکھلایا گیا ہے۔

موجودہ زمانے میں صنعتی طاقت کا دارومدار، کوئلے، لوہے اور معدنی تیل کی تثلیث پر ہے۔ ہمارے موجودہ فولادی دور میں۔ کوئلہ اور لوہا مل کر صنعتی نظام کی بنیاد کا کام انجام دیتے ہیں مشین کی ترقی کے لئے ان کی اہمیت ویسی ہی ہے جیسی کہ انسانی جسم کی نشوونما کے لئے ہائیڈروجن اور آکسیجن کی ہوتی ہے۔ ان دونوں کا ساتھ ساتھ پایا جانا ضروری ہے۔ معدنی تیل بھی اگرچہ بہت بیش قیمت چیز ہے لیکن یہ اتنا لازمی اور ناگزیر نہیں ہے اس زمانے میں اگر کسی ملک کے پاس کوئلے کے ذخیرے بافراط موجود ہوں اور معدنی اشیاء کا مبادلہ آزادانہ طریقے پر ہو سکتا ہو تو وہ معدنی تیل کے ذخیروں کے بغیر بھی اپنا کام چلا سکتی ہے۔ جب اس کے پاس معدنی تیل نہیں ہوگا تو وہ اپنے کوئلے کو مایع ایندھن کی شکل میں تبدیل کرسکے گی جیسا کہ جرمنی آج کر رہا ہے۔ فولاد کے تیار کرنے میں معدنی تیل کی براہ راست کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ فولاد کی صنعت میں اسے کوئلے کی جگہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا کوئلے کا موجود ہونا لازمی ہے۔

مجموعی قدروقیمت اور تقسیم دونوں اعتبار سے سلطنت ہند کی معدنی صنعتی پیداوار دولت میں انفرادی طور پر کوئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی قسموں میں اعلیٰ اور ادنیٰ کا فرق پایا جاتا ہے اور گرافائیٹ سے لے کر مقامی انتھراسائیٹ تک ہر قسم کا کوئلہ ملتا ہے اور یہ ہر حالت میں دستیاب ہوتا ہے لیکن بہترین اور مقدار کے لحاظ سے کثیر ترین یعنی ۹۸ فی صدی سے زائد وہ کوئلہ ہے جو متوسط درجے کی قدیم (یعنی پرمین عہد کی) چٹانوں سے حاصل کیا جاتا ہے اور اس طرح کی چٹانیں خاص طور پر تین صوبوں بنگال، بہار اور اڑیسہ میں ملتی ہیں۔

عام طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ بہتر قسم کے کوئلے کے بڑے علاقے ایک کمان کی صورت میں مغرب میں اس جگہ سے شروع ہوتے ہیں جہاں دریائے گنگا صوبہ بہار کی حدود کو پار کر کے صوبہ بنگال میں داخل ہوتا ہے اور جہاں اس دریا کے اندر ایک بڑا سا خم پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ علاقے کسی قدر جنوب میں ہٹتے ہوئے صوبہ جات متوسط کے مغرب تک چلے گئے ہیں اور پھر یکبارگی

جنوب مشرق کی طرف سے گھوم کر احاطہ مدراس میں دریائے گوداوری کے دہانے کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ ناظرین کو چاہیے کہ اس موقع پر ساتھ کے نقشے کو دیکھیں اور بہار اور اڑیسہ کے مشرقی صوبوں کی طرف خاص طور پر توجہ کریں۔ یہ وہ صوبے ہیں جن میں ہندوؤں کی بہت غالب اکثریت ہے یعنی ۱۹۳۱ء میں تین کروڑ دس لاکھ ہندوؤں کے مقابلے میں اس علاقے میں صرف ۴۲ لاکھ مسلمان پائے جاتے تھے۔ مذہبی بنیاد پر سلطنت ہند کی جو بھی تقسیم ہوگی اس میں یہ دونوں صوبے ضرور ہندوستان میں شامل کیے جائیں گے۔ لیکن چونکہ سلطنت ہند کی نفیس ترین معدنی دولت کا خزانہ یہاں جمع ہے اور اس میں ملک کے اعلیٰ ترین کوئلے کے ذخیرے بھی شامل ہیں اس لئے صنعتی ترقی کے نقطۂ نگاہ سے انھیں اس ملک کے اہم ترین حصے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ بات لائق توجہ ہے کہ یہ دونوں بنگال کی پاکستانی مملکت کے قریب واقع ہیں اور بہار کا صوبہ بنگال اور شمال مغرب کی پانچ مسلمان پاکستانی مملکتوں کے درمیان براہ راست حائل ہے۔ ایک ماہر ارضیات اس بات کو بھی لائق توجہ سمجھے گا کہ بنگال اور بہار کی ارضیاتی خصوصیات ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں جس قسم کی چٹانیں ایک صوبے میں ملتی ہیں زیادہ تر ویسی ہی دوسرے صوبے میں بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ بنگال کے کوئلے کے علاقے دراصل بہار اور اڑیسہ کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہیں۔

وسط ہند میں کئی کوئلے کے علاقے پائے جاتے ہیں جن میں جوہیلا کا کوئلہ کا علاقہ، وسعت اور قدر و قیمت کے لحاظ سے سب سے بڑا ہے اس علاقے کے محفوظ ذخیروں کے تخمینوں میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک طرف اگر ان کا اندازہ تین کروڑ ٹن کیا گیا ہے تو دوسری طرف دس کروڑ ٹن کیا گیا ہے۔ بہر حال انھیں مستقبل میں وسط ہند کے اندر غالباً سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہے گی۔ صوبہ جات متوسط میں دریائے وردھا کی وادی کا کوئلہ کا علاقہ سب سے زیادہ وسیع ہے اس میں ڈیڑھ ارب ٹن کوئلہ موجود ہے۔ بلوچستان میں بھی کوئلے کے ایسے علاقوں کو جو دوسرے علاقوں سے الگ تھلگ ہیں ترقی دی گئی ہے۔

لیکن کوئلے کے سب سے زیادہ بڑے علاقے جن میں عام کاموں اور مختلف استعمالوں کے

لئے خصوصاً کوک بنانے کے لئے موزوں ترین کوئلہ دستیاب ہوتا ہے اور جو ساتھ ہی ساتھ ریل اور سمندر سے بھی بہت قریب ہیں۔ بہار اور اڑیسہ اور اسی سلسلے کی شمال مشرقی کڑی یعنی بنگال کے کوئلے کے علاقے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان جو تخمینے کئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں مجموعی طور پر دس ارب پندرہ کروڑ ٹن اچھے قسم کا کوئلہ موجود ہے۔ یہ ذخیرے زیادہ تر حسب ذیل مقامات پر مجتمع ہیں۔ کرن پورہ کے کوئلے کے علاقے (بہار) اور بکارو کا علاقہ۔[۵۱] (بہار)۔ اس سے اور زیادہ جنوب مغرب میں دریائے گوداوری کی وادی کے علاقے ہیں۔ ان کا سلسلہ حیدرآباد اور مدراس بلکہ تقریباً سمندر کے قریب کوکاناڈا تک چلا جاتا ہے۔ ان میں تقریباً چھ ارب چالیس کروڑ[۵۲] اعلیٰ قسم کا کوئلہ موجود ہے۔ صرف ان دونوں خطوں کے محفوظ ذخیرے آسانی کے ساتھ چار سو سال تک چل سکتے ہیں

غرض سلطنت ہند کے اعلیٰ کوئلے کے ذخیروں کا نمبر صرف مندرجہ ذیل ملکوں کے بعد آتا ہے: چین، سوویٹ روس، پولینڈ، جرمنی، انگلستان، کناڈا، ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ لیکن پھر بھی یہ صورت مجموعی یہ تھوڑے سے رقبے کے اندر محدود ہیں اور یہ محدود تقسیم سلطنت ہند کی ایسی صنعتی ترقی کی راہ میں جو ملک کے ہر حصے میں پھیلی ہوئی ہو ایک زبردست رکاوٹ ہے ان واقعات کی روشنی میں سلطنت ہند کے مستقبل کے بارے میں معقول حد تک پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ اس کے صنعتی مرکز کس جگہ واقع ہوں گے۔

معاشیات کا ماہر یہ کہے گا کہ سلطنتِ ہند بہت خوش قسمت ہے کہ اس کے کوئلے کے ذخیرے اس کے لوہے کے بڑے ذخیروں کے بالکل قریب واقع ہیں۔ کیونکہ اس ملک کے لوہے کی پیداوار

---

۵۱ سی۔ ایس۔ فاکس "دی لوور گونڈوانہ کول فیلڈز آف انڈیا" جیالوجیکل سروے آف انڈیا۔ میمائرس جلد ۵۹ ۱۹۳۴ء

۵۲ مری۔ بال او۔ ار۔ ار۔ سمپس۔ دی کول فیلڈز آف انڈیا: جیالوجیکل سروے آف انڈیا۔ میمائرس جلد ۴۱ ۱۹۱۳ء

بھی یہاں کے کوئلے کی طرح زیادہ تر بہار اور اڑیسہ ہی کے ذخیروں سے حاصل کی جاتی ہے جن کا سلسلہ شمال میں پہنچ کر بنگال میں داخل ہو جاتا ہے۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۲ء تک بہار میں لوہے کی مجموعی پیداوار تقریباً دو کروڑ بیس لاکھ ٹن کچ دھات کے برابر ہوتی تھی جس کی قیمت موٹے طور پر ۲۴ لاکھ ۵۱ ہزار پونڈ ہوتی تھی[۵۱]۔ موجودہ جنگ کے شروع ہونے تک کے تازہ ترین اعداد کے دیکھنے سے اس کے بعد بھی مسلسل ترقی کا پتہ چلتا ہے[۵۲]۔ لوہے کی ایسی کچ دھاتیں جن میں لوہا مالیقی پیداوار کی صورت میں دستیاب ہوتا ہے۔ جزیرہ نمائے ہند میں زیادہ وسیع طریقہ پر بکھری ہوئی ملتی ہیں اور یہ ایسی شکلوں میں ملتی ہیں جو مقدار میں ہر چند مختصر ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کی قسم عموماً اوسط درجے سے بہتر درجے تک کی ہوتی ہے۔ اس نوع کے ذخیرے وسط ہند میں خصوصیت کے ساتھ دستیاب ہوتے ہیں مگر کچ دھاتوں میں سب سے اہم ایک حد تک اس لحاظ سے کہ یہ مسلسل ملتی ہے اور اس کا حاصل کرنا ممکن ہے وہ ہے جو کناڈا اور ریاستہائے متحدہ کی جھیل سپیریر کی لوہے کی کچ دھات سے مشابہ ہے اور جو سلطنت ہند میں مشرقی صوبوں خاص طور پر بہار اور اڑیسہ میں ملتی ہے۔ اور نسبتاً زیادہ مختصر مقدار میں لیکن پھر بھی اہم شکل میں بنگال میں اور مقامی طور پر سلطنت ہند کے دوسرے علاقوں میں بھی ملتی ہے۔

ان مختلف قسم کے لوہے کے محفوظ ذخیروں کا تخمینہ لگانا مشکل ہے۔ سب سے زیادہ توجہ بہار اور اڑیسہ کی کچ دھاتوں کی طرف کی گئی ہے اور ان تخمینوں کے ذریعے ایسی کانوں کی میزانیں جن سے کچ دھات کو نفع بخش طریقے پر حاصل کیا جا سکتا ہے حسب ذیل ہیں[۵۳]:۔

---

۵۱ جے، سی، براؤن "انڈیاز منرل ویلتھ" لندن آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۳۶ء ص ۱۰۶

۵۲ ایس جی، کون "آئرن اینڈ اسٹیل" منرل انڈسٹری ڈیورنگ ۱۹۳۸ء میں مرتبہ جی ٹیلے روتھ نیویارک: میک گرا ۱۹۳۹ء ص ۳۵۳

۵۳ ایچ، سی، جونس "دی آئرن اور ڈپازٹس آف بہار اینڈ اڑیسہ" جیالوجیکل سروے آف انڈیا، میمائرز جلد ۶۳ حصہ دوم ۱۹۳۴ء ص ۱۶۹ تا ص ۲۵۵

ضلع سنگ بھوم (اڑیسہ)	ایک ارب چار کروڑ ستر لاکھ ٹن
ریاست کیونجھار	نو کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن
ریاست بونائی	چھ کروڑ ۴۰ لاکھ ٹن
ریاست مایر بھنج	۱۸ لاکھ ٹن

میزان = دو ارب ۰۰ کروڑ دس لاکھ ٹن

زیادہ حال میں جو تخمینے کئے گئے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعداد ایک حد تک بہت کم ہیں[1]

جو کچھ دھاتیں اب کانوں سے نکالی جا رہی ہیں ان کے اندر چونکہ پچاس فی صد لوہا نکلتا ہے اس لئے اس حساب سے دھات کی شکل میں لوہے کے محفوظ ذخیروں کا تخمینہ ایک ارب چالیس کروڑ ٹن کیا جا سکتا ہے یعنی یہ مقدار اتنی ہے کہ موجودہ شرح استعمال سے پانچ سو سال کے لئے کافی ہو یہ درست ہے کہ اس موافق تخمینے میں لوہے کے استعمال میں جو نمایاں اضافہ ہو رہا ہے اس کو بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس میں یہ کسر بھی ہے کہ آیندہ جو لوہے کی نئی کانوں کے دریافت ہونے کا امکان ہے اس کو بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اخیر میں اس قدر اور کہہ دینا ضروری ہے کہ دنیا میں جس قدر لوہے کی کچ دھاتیں پائی جاتی ہیں ان میں سلطنت ہند کی کچ دھاتوں کا شمار نسبتاً اعلیٰ درجے میں کیا جا سکتا ہے۔

باوجود اس کے کہ سلطنت ہند نے لوہے اور فولاد کو ابھی حال ہی میں قابلِ لحاظ مقدار میں پیدا کرنا شروع کیا ہے لیکن پھر بھی اس نے موجودہ جنگ سے قبل انھیں برآمد کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۳۷ء-۱۹۳۸ء میں نیم مصنوعہ لوہے (پگ آئرن) کا ۵۵ فی صد حصہ (۲۲ لاکھ ۱۰ ہزار ۴۸ ٹن) جاپان کو برآمد کیا جاتا تھا اور بقیہ دو لاکھ ۱۵ ہزار ۸۰ ٹن سلطنت متحدہ برطانیہ کو اور

---

[1] ایم۔ ایس کرشنان جن کا حوالہ ایچ۔ سی۔ جونس نے مندرجہ بالا تصنیف میں ہے۔

۰۰ ہزار ۳۰ ٹن ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو۔[۵] غالباً فولاد کا بیشتر حصہ بھی جاپان ہی کو برآمد کیا جاتا تھا سلطنت ہند باہر سے صرف خاص قسم کے نیم مصنوعہ لوہوں کو درآمد کرتی تھی اور بقیہ نیم مصنوعہ لوہے کے لئے وہ کسی غیر ملک کی محتاج نہیں رہی تھی۔ لیکن فولاد کے بعض مرکبات کو جن میں فیرو ایلائیز Ferro Alloys اور بہت سی قسموں کے خاص خاص شکلوں کے بنے ہوئے فولاد شامل ہیں اس کو باہر سے منگانا پڑتا تھا۔ واقعہ یہ ہے، فولاد کی سلاخیں اور فولاد کی چادریں اور اسی قسم کے دوسرے کچے سامان جن کی فولاد کے بنانے میں ضرورت ہوتی ہے ابھی تک یہاں بہت محدود مقدار ہی میں تیار کئے جاتے ہیں۔

۱۹۳۲ء میں سلطنت ہند میں اس صنعت کے چار بڑے کارخانے تھے:

(۱) برن پور میں انڈین آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی جس میں دو پون بھٹیاں ہیں جن میں سے ہر ایک کی سالانہ صلاحیت پیداوار ڈیڑھ لاکھ ٹن ہے۔

(۲) شموگا میں، میسور آئرن ورکس جس میں چار لکڑی کے کوئلے کی بھٹیاں ہیں۔

(۳) کلٹی میں بنگال آئرن کمپنی جس میں پانچ پون بھٹیاں ہیں جن کی مجموعی سالانہ صلاحیت پیداوار ڈھائی لاکھ ٹن نیم مصنوعہ لوہا ہے۔

(۴) ٹاٹا آئرن کمپنی جس کے جمشید پور کے بڑے کارخانے میں نیم مصنوعہ لوہا تیار کرنے کی صلاحیت پانچ لاکھ دس ہزار ٹن سالانہ ہے اور جس کے اندر کہا جاتا ہے کہ ترقی کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ جنگ نے اس صنعت کی ترقی کو تیز کر دیا ہے اور اگر اسے معقول سرپرستی ملتی رہی تو اُمید ہے کہ ہندوستان کی لوہے اور فولاد کی پیداوار اس کے زمانے کی ضرورتوں کے لئے بھی بڑھتی رہے گی یہاں تک ملکی ضرورت کے پورا کرنے کے لئے کافی ہو جائے گی۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ سلطنت ہند کے تمام ممتاز لوہے کے علاقے ہندوستان میں

---

[۵] اے۔ ایم۔ ہیرون "دی منرل پروڈکشن آف انڈیا اینڈ برما ڈیورنگ ۱۹۳۴ء" جیالوجیکل سروے آف انڈیا میمائرز جلد ۷۰، ۱۹۳۶ء حصہ سوم صفحہ ۲۷

واقع ہیں۔ پاکستان کے مغربی حصے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے لوہے کے ذخیرے ہیں لیکن کوئی ایسا نہیں ہے جو ایک بڑے فولاد کے کارخانے کی ضرورت کے لئے کافی ہو۔ اس عام بیان سے اڑیسہ کی ان کچھ دھاتوں کو مستثنےٰ کیا جا سکتا ہے جو شمال اور مشرق کی طرف پھیلنے کے بعد بنگال کے اندر داخل ہو جاتی ہیں اور جن کی بنیاد پر بنگال آئرن کمپنی کو قائم کیا گیا ہے۔ اس کمپنی نے اپنا کام [illegible] میں شروع کیا ہے۔ لیکن بنگال کے یہ ذخیرے بھی اڑیسہ کے مقابلے میں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔

صنعتی طاقت کے تیسرے اہم جزو یعنی پٹرولیم کی رسد سلطنت ہند میں اتنی اچھی نہیں ہے گو یہ صحیح ہے کہ حال کے سالوں میں اس ملک کی پیداوار میں بہت ترقی ہوئی ہے اور اب پیداوار کی سالانہ مقدار ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن غیر صاف شدہ پٹرول ہو گئی ہے۔ یہ اضافہ بہت معلوم ہوتا ہے لیکن مقامی ضروریات کے لئے ناکافی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جتنے گیلن ایندھن کا تیل اور مٹی کا تیل ہندوستان کے چشموں سے نکالا جاتا ہے اتنے ہی گیلن باہر سے بھی منگایا جاتا ہے۔ اگر بڑے پیمانے کی صنعت کو ترقی دی گئی اور ریاست ہائے متحدہ یا کوہ قاف کے طریقوں کو مسلسل طور پر شدت کے ساتھ یہاں بھی اختیار کیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ کم سے کم عارضی مدت کے لئے سلطنتِ ہند کی ضروریات کے لئے اس ملک کے پٹرولیم کی رسد کافی ہو جائے۔ لیکن اس لحاظ سے سلطنت ہند کے مستقبل بعید کو روشن نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا کی پٹرولیم کی مجموعی رسد کے مقابلے میں سلطنتِ ہند کی سالانہ پیداوار ایک فی صد حصے سے بھی کم ہے اور اس مختصر مقدار کا بھی ۳/۵ حصہ برما سے حاصل کیا جاتا ہے۔

خاص سلطنتِ ہند کے تیل کے چشمے دو علاقوں میں واقع ہیں۔ اول آسام میں کچھ تیل کے علاقے سلسلے ہیں جو ایک پورٹری کی ان کی صورت میں مشرقی بنگال تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ یہ برما کے نیانگ ینگ اور دوسرے تیل کے چشموں کے بالکل متوازی واقع ہیں۔ لیکن ابھی تک یہاں صرف تیل کے دو اہم علاقوں کا پتہ لگایا جا سکا ہے۔ ایک ڈگ بوئی میں ہے اور دوسرا بدر پور میں۔

ایک زمانے میں بدرپور کے علاقے میں تیل کی پیداوار بہت زیادہ تھی لیکن یہ پیداوار گھٹتی گئی سنہ ۱۹۲۱ء میں اس سے صرف ۸۰ لاکھ، ۴ ہزار گیلن حاصل ہوا تھا اور سنہ ۱۹۳۵ء میں بظاہر کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ ڈگ بوئی کے علاقے کی پیداوار سنہ ۱۹۳۸ء میں ۶ کروڑ، ۷۶ لاکھ ۸۱ ہزار، ۳۷۴ گیلن تھی اور آئندہ اس سے بھی زیادہ حاصل ہونے کی اُمید ہے۔ دوسرا اہم خطہ پنجاب کا ہے جہاں تین امید افزا تیل کے علاقے پائے جاتے ہیں یعنی کھور، ڈھولیاں اور چھرت۔ کھور کی پیداوار حال میں کم ہوگئی ہے۔ لیکن یہاں بہت سی گہرائیوں میں "تیل والی ریت" اور موافق ساخت دریافت کی گئی ہیں جس سے چشموں کے ملنے کی اُمید ہے۔ سنہ ۱۹۳۸ء کی رپورٹ میں چھرت کی پیداوار درج نہیں کی گئی تھی۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں کھور اور ڈھولیاں کے علاقوں کی مجموعی پیداوار ۹۹ لاکھ ۳۹ ہزار ۴۲۰ گیلن بتلائی گئی تھی۔

یہ بات خاص طور پر لائق توجہ ہے کہ اب تک جس قدر پٹرولیم کی موجودگی کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ سلطنت ہند کے مسلم حصے میں ہیں۔ ہندوستان کے اہم مرکزی حصے یعنی جزیرہ نما میں ارضیاتی ساخت اس نوعیت کی ہے جس میں پٹرولیم کے دریافت ہونے کا امکان نہیں پایا جاتا۔ دوسری اہم اور لائق توجہ بات یہ ہے سلطنت ہند کے مشرقی ہمسایہ یعنی برما کے پاس پٹرولیم بہ افراط موجود ہے۔

صنعتی طاقت کے اہم عناصر ترکیبی میں مینگنیز اور کرومیم کا درجہ بھی بہت بلند ہے کیونکہ ان کی آمیزش ہی سے اعلیٰ معیار کا فولاد تیار کیا جا سکتا ہے۔ سلطنت ہند میں ایسے تہ نشین مادے بہ کثرت موجود ہیں جن سے مینگنیز یعنی اُس لائق آمیزش دھات کو جو فولاد کو سخت اور مضبوط بناتی ہے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حال کے سالوں میں سلطنت ہند کی پیداوار کا درجہ دنیا کے مینگنیز کے مرکزوں میں اول یا دوم رہا ہے۔ مثال کے طور پر سنہ ۱۹۳۸ء میں سلطنت ہند کی پیداوار کا نمبر سوویٹ روس کے بعد آتا تھا لیکن اپنے دوسرے حریف جنوبی افریقہ کے مقابلے میں اس کی پیداوار دُگنی تھی۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں جن ممتاز صوبوں سے اس حاصل کیا جاتا تھا وہ حسب

ذیل ہے؛

صوبہ جات متوسط جہاں کل کچ دھات کا ۵۷ر۸ فی صد حاصل کیا جاتا تھا بمبئی ۵ر۵ فی صد، بہار اور اڑیسہ ۱ر۱ فی صد اور میسور ۵ر فی صد۔ لیکن یہ سب صوبے ہندوستان کا جز ہوں گے۔ پاکستان کا نہیں ہوں گے۔ مینگنیز کو جہازوں کے ذریعے برآمد کرنے کا کام بھی کلکتے کے علاوہ سلطنت ہند کے ہندو علاقے کے ساحلی شہر انجام دیتے رہتے ہیں اور احاطۂ مدراس میں وزاگاپٹم کی نئی بندرگاہ کی ترقی نے اس اہم کچے مال پر ہندوؤں کے قبضے کو اور زیادہ مستحکم کر دیا ہے۔

مینگنیز کے بعد دوسرا آمیزہ جسے فولاد کے بنانے میں بہت اہمیت حاصل ہے کرومیم ہے۔ اس کا فائدہ زیادہ تر یہ ہے کہ یہ فولاد کی سختی اور مضبوطی میں اضافہ کر دیتا ہے لیکن اگر اسے خاص تناسب کے ساتھ ملایا جائے تو یہ فولاد کے اندر زنگ کے مقابلہ کرنے کی بھی زیادہ اہلیت پیدا کر دیتا ہے۔ سلطنت ہند میں کروم کے علاقے دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن زیادہ تر بلوچستان، میسور، بہار اڑیسہ میں واقع ہیں۔ اس کے محفوظ ذخیروں کے بارے میں تخمینے موجود نہیں ہیں۔ لیکن تہ نشینوں کی نوعیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف صوبوں میں جس نسبت سے اسے فی الحال حاصل کیا جا رہا ہے اسی نسبت سے اس کے محفوظ ذخیرے بھی منقسم ہیں۔ اس بنیاد پر انھیں پاکستان اور ہندوستان میں تقریباً برابر قرار دیا جا سکتا ہے[1]۔

قیمتی دھاتوں کا جہاں تک تعلق ہے ان میں سونے کی رسد سلطنتِ ہند میں اچھی خاصی ہے میسور میں کولار کا ضلع ہندو علاقہ میں واقع ہے اور اس کی کانوں میں ۲۴ ہزار مزدور

---

[1] مالیبڈینم جس کی اہمیت فولاد کے آمیزہ کی حیثیت سے روز بروز بڑھتی جا رہی ہے وسط ہند کے ہندو علاقوں میں کئی مقامات پر پایا جاتا ہے اور یہی بات فولاد کے دوسرے عام آمیزوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

کام کرتے ہیں اور ۱۹۳۷ء میں ان کانوں کی پیداوار ۳ لاکھ ۳ ہزار ۱۰ ٹرائے اونس تھی حقیقت یہ ہے کہ اس ضلع کا شمار دنیا کے ممتاز ترین سونے کے علاقوں میں کیا جا سکتا ہے۔ احاطۂ مدراس کے ضلع اننت پور میں بھی سونے کے نسبتاً کم ذخیرے ملتے ہیں لیکن ان سے کام نہیں لیا جا رہا ہے۔ برما کے ضلع باڈودن میں چاندی کو دوسری بہت سی دھاتوں کے ساتھ کھودا جاتا ہے لیکن حال کے سالوں میں اصل سلطنت ہند سے چاندی کی قابلِ لحاظ پیداوار حاصل نہیں کی گئی ہے۔

غیر آہنی ادنےٰ تر دھاتوں میں باکسائیٹ جس سے المونیم نکالا جاتا ہے سلطنت ہند میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہے کچھ تو کشمیر کے پاکستانی علاقے میں ہے لیکن زیادہ تر ہندو علاقہ میں ہے یعنی صوبہ جات متوسط، بمبئی اور بہار میں[۵] لیکن سلطنتِ ہند کی اس قسم کی دھات کی قسم کچھ زیادہ نفع بخش نہیں ہے اور دوسرے عوامل بھی اس صنعت کے موافق نہیں ہیں اس لئے باوجود اس کی وسیع تقسیم کے، باکسائیٹ کی کان کنی اور المونیم کی صنعت کو سلطنت ہند کی صنعتی زندگی میں بصورت مجموعی زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ آئندہ کے بارے میں توقع یہ ہے کہ جس قدر المونیم، ہلکی دھات کی منڈی پر اپنا قبضہ قائم رکھ سکے گا۔ اسی قدر اس صنعت کی ترقی بھی آہستہ آہستہ ہوتی رہے گی۔ آج کل جو المونیم بنایا جاتا ہے وہ صرف مقامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے المونیم کے برتن بنانے کا کام مختلف کارخانوں میں متوسط پیمانہ پر ترقی کر رہا ہے۔ لیکن یہ کارخانے زیادہ تر ہندو علاقے میں میں پائے جاتے ہیں۔

تانبا سات ہزار ٹن سالانہ کی مقدار میں حاصل کیا جاتا ہے۔ قابل لحاظ کانیں صرف دو ہیں اور دونوں صوبے اُڑیسہ کے ضلع سنگ بھوم میں موسابونی اور دھوبنی میں واقع ہیں

---

۵ سی۔ ایس۔ فاکس "دی باکسائیٹ اینڈ ایلومینس لیٹرائٹ آکرنسز آف انڈیا" جیالوجیکل سروے آف انڈیا میمائرز جلد ۴۹ ۱۹۲۳ء حصہ اول صفحہ ۹۲ تا صفحہ ۱۸۷

سیسہ اور جست برما میں با فراط موجود ہیں لیکن اس سے ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسی طرح سلطنت ہند کے دھات کے کارخانوں کے لئے ٹین اور نکل کا ماخذ بھی برما ہی ہے۔

ہر اس مملکت میں جہاں بڑے پیمانے کی صنعت کو فروغ دیا جانے والا ہو بعض ادھاتی معدنیات کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے مشین کے استعمال اور تجدد پسندی کی ابتدائی منزلوں میں تو ان کی اہمیت زیادہ نہیں ہوتی لیکن جوں جوں مصنوعات کا کام ترقی پاتا جاتا ہے اور خصوصاً ان کیمیادی صنعتوں کو نشو و نما ملتی ہے جو گنجان آبادی اور متنوع پیشے رکھنے والے اکثر بڑے ملکوں میں پائی جاتی ہیں تو ان کی اہمیت تیزی کے ساتھ بڑھنے لگتی ہے۔ ان ادھاتی معدنیات میں خاص طور پر حسب ذیل چیزیں نمایاں نظر آتی ہیں:

نمک، چونا، گندھک، جپسم، چکنی مٹی اور میگنیسائیٹ، نیز فاسفیٹ اور پوٹیسم، حاصل کرنے کے ذرائع۔

گندھک کے علاوہ باقی ان سب چیزوں کے تہ نشیں سلطنت ہند میں دریافت کئے جا چکے ہیں اور انھیں کام میں بھی لایا جا رہا ہے۔ چونا دور دور تک پھیلا ہوا ہے اور پلاستر اور سمنٹ کے بنانے اور وزنی کیمیادی صنعتوں میں اس سے اس حد تک کام لیا جا رہا ہے جس حد تک کہ نقل و حمل کی سہولتیں اور مقامی ضرورت اس کی اجازت دیتی ہے۔ ہمارا یہ مفروضہ بے جا نہ ہوگا کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کو معمولی کاموں کے لئے اپنے حدود کے اندر کافی چونا دستیاب ہو سکے گا۔ یہی بات جپسم کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ نمک کو پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں جو دونوں پاکستان میں ہیں۔ پتھریلی چٹانوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ لیکن سلطنت ہند کا ۸۰ فی صد نمک سمندر کے پانی کو خصوصاً بمبئی اور مدراس میں اور جھیل کے پانی کو زیادہ تر راجپوتانے میں سکھا کر حاصل کیا جاتا ہے اور یہ سب کام ہندوستان میں ہوتا ہے۔ بہرحال اس اہم کیمیادی مادے کے محفوظ ذخیرے باوجود اس زائد طلب کے

جو بڑی کیمیاوی صنعتوں کی ترقی کی وجہ سے پیدا ہوگی۔ پاکستان میں بھی بہت کافی سمجھے جا سکتے ہیں۔ برتن بنانے کی چکنی مٹی، چینی مٹی اور آگ میں نہ پگھلنے والی مٹی بھی، سلطنت ہند میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اور اگرچہ ان کے محفوظ ذخیروں کے تخمینے موجود نہیں ہیں لیکن یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں اس لحاظ سے خود مختار حیثیت کے مالک ہیں۔ آگ میں نہ پگھلنے والی مٹی کے بہترین ذخیرے مشرق کے کوئلے کے علاقوں میں ملتے ہیں اور مجوزہ مشرقی پاکستان اور ہندوستان کی حدود کے آر پار پھیلے ہوئے ہیں۔ میگنیسائیٹ جس کو بعض سمنٹ کی قسموں میں دیر گُسل (یعنی دیر میں پگھلنے والے) جز کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے اور جس سے مگنیسم کے بنانے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ مدراس میں بڑی مقدار میں دستیاب ہوتا ہے۔ میسور میں اس کے ذخیرے نسبتاً کم ہیں لیکن ان کی پیداوار اچھی ہے۔ سلطنتِ ہند کا ابرک اور کائی نائٹ بھی وسیع پیمانے پر زیادہ تر ہندو علاقے ہی سے برآمد کیا جاتا ہے۔

فاسفیٹ بلاشبہ نہ صرف صنعت کے لئے مفید ہیں بلکہ زراعت کے لئے بھی ناگزیر ہیں۔ یہ بات سلطنت ہند جیسے پرانے ملکوں پر خاص طور پر منطبق ہوتی ہے جہاں بہت بہت صدیوں سے کاشت کا کام نہایت عمیق طریقے پر کیا جا رہا ہے اور جہاں اس بنا پر زمین کی زرخیزی یا تو ختم ہو گئی ہے یا ختم ہونے کے قریب ہے۔ تمام سلطنتِ ہند کی زمینوں میں (جس میں ہندوستان اور پاکستان یکساں طور پر شامل ہیں) فاسفیٹ کے ذرائع کی افسوس ناک حد تک کمی پائی جاتی ہے۔ کھادوں کی ایک بڑی مقدار کو ہر سال باہر کے ملکوں سے درآمد کیا جاتا ہے اور ان میں ایک تہائی کھاد ایسے ہوتے ہیں جن کا مقصد مسلسل محروم شدہ زمین کو فاسفیٹ فراہم کرنا ہوتا ہے۔ فاسفیٹ کے حاصل کرنے کا ایک ادنیٰ تر ذریعہ بہار اور اڑیسہ کے دو وسیع طور پر متضاد علاقوں میں دستیاب ہوتا ہے جہاں اس سے فائدہ اٹھانے میں خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک دوسرا ذریعہ

جس سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا ہے۔ پنجاب کے کوئلہ رکھنے والے سلیٹی پتھر اور جنوبی ہند کی مختلف چٹانیں ہیں۔ لیکن اس معدنی پیداوار کے خاص ذرائع بھی چاہے اُسے طبعی حالت میں حاصل کیا جائے چاہے مصنوعی طریقے پر زیادہ تر ہندوستان ہی میں ملتے ہیں۔ پوٹیشیم کے ذرائع جو ایسی زمین کے لئے جس پر کاشت کا سلسلہ ایک عرصے سے اور عمیق طریقے پر جاری رہا ہو پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہ یکساں طور پر دستیاب ہوتے ہیں۔

(۴)

سلطنتِ ہند کے معدنی وسائل کے مندرجہ بالا جائزہ سے باوجودیکہ یہ مختصر ہے پہلا ظاہری نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ سلطنتِ ہند میں معدنی تیل کی رسد کافی مقدار میں موجود نہیں ہے لیکن اہم ترین صنعتی معدنیات مثلاً کوئلہ، لوہا کئی ایک ایسے آہنی آمیزے جو اچھے فولاد کے بنانے میں کام آتے ہیں اور ضمنی معدنیات کے بڑے ذخیرے موجود ہیں اور یہ اتنی کافی مقدار میں ہیں کہ وہ اس ملک کو ایک طاقت ور اور کافی بالذات صنعتی قوم بنا سکتے ہیں۔ اکثر دوسری بڑی صنعتی اقوام کے مقابلے میں ان کی رسد فی کس کم ہے۔ لیکن لازمی معدنیات کے محفوظ ذخیروں کو خطرے میں ڈالے بغیر ان کے استعمال فی کس کو مستقبل قریب میں خاصی معقول حد تک ترقی دی جاسکتی ہے۔

اس رپورٹ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنتِ ہند کے یہ معدنیات اس ملک کے اُن مختلف علاقوں میں جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے۔ کچھ اس طریقے پر منقسم ہیں کہ اگر سلطنت ہند کو مذہبی آبادی کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا تو ہندو مملکت دولت مند اور مسلم مملکت نمایاں طور پر مفلس ہو جائے گی۔ یہ عدم توازن اتنا زیادہ ہے کہ اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے دونوں علاقوں کی آبادی کی گنجانی میں جو اختلاف ہے وہ بھی بصورت مجموعی کچھ زیادہ کارگر ثابت نہ ہو سکے گا۔ پھر اس پیداوار

لحاظ کرتے ہوئے جو اس وقت حاصل کی جارہی ہے ہندو علاقے کی نسبتاً زاید معدنی دولت صرف موجودہ زمانے ہی کے لئے زیادہ نہیں ہے بلکہ جیسے جیسے سلطنتِ ہند میں صنعتی ترقی زیادہ ہو گی یہ فرق بلاشبہ اور بھی زیادہ نمایاں ہوتا چلا جائے گا۔ سلطنتِ ہند کو پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اس سوال کا جواب دراصل ان ہی بنیادی واقعات سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔

سلطنتِ ہند میں کوئلہ اور لوہے کے بڑے محفوظ ذخیرے موجود ہیں۔ اس کے پاس آہن آمیز دھاتوں کے اچھے ذخیرے ہیں (اگرچہ ایک حد تک یہ نامکمل ہیں اور کچھ دوسرے آمیزوں کو باہر سے درآمد کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔) اسی طرح ادھاتی معدنیات اور سونے کے بھی اچھے ذخیرے ہیں۔ سوائے میگنیسائیٹ کے اور باقی تمام دوسری ضمنی معدنیات کے بھی اس کے پاس کافی ذخیرے ہیں اور معدنی تیل بھی ہے۔ یہ سب باتیں سلطنتِ ہند کی صنعتی ترقی کے لئے ساز گار ہیں۔ لیکن ایک عام بیان کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سلطنتِ ہند کے تقسیم ہو جانے کے بعد کوئلے کا ۹۰ فی صد اور لوہے کا ۹۲ فی صد حصہ ہندوستان میں پہنچ جائے گا اور بقیہ پاکستان میں رہے گا اور پاکستان کا یہ بقیہ لوہا اور کوئلہ بھی گھٹیا قسم کا ہوگا ان تمام آہنی آمیزوں اور ضمنی معدنیات کی جو ایک کافی بالذات صنعتی علاقہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے درکار ہیں۔ ہندوستان میں بیشتر تعداد موجود ملے گی اور پاکستان میں بھی ان میں سے کچھ موجود ملیں گے۔ متوسط درجے کی صنعتی ترقی اور ایک خاصے بلند معیار زندگی کو حاصل کرنے کے لئے جس قدر معدنی تیل کی ضرورت، داخلی احتراق کے انجنوں کو چلانے کے لئے ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں سلطنتِ ہند کے پاس تیل کے ذخیرے کم ہوں گے اور جتنے ہوں گے ان کا بیشتر حصہ پاکستان میں مل سکے گا۔

ان واقعات کی بنیاد پر ہمارا دوسرا نتیجہ مختصراً یہ ہے کہ سلطنتِ ہند کے ہندو اور مسلم علاقے ایک دوسرے کے محتاج اور پابند ہیں نہ صرف ہندوستان کو تقسیم کے بعد پاکستان کی

بعض چیزوں کی ضرورت باقی رہے گی بلکہ پاکستان کو بھی اپنی صنعتی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ہندستان کے وسائل کی نہایت بُری طرح ضرورت لاحق رہے گی۔

اگر تقسیم کے بعد ان دونوں تقسیم شدہ علاقوں نے آزاد تجارت کو بند کر دیا تو بنگال کی پاکستانی مملکت صنعتی حیثیت سے بالکل فنا ہو جائے گی اور یہ صورت حال ایسی ہوگی جو لوگوں کو زور اور زبردستی سے کام لینے کی طرف مائل کرے گی۔ مسلم مملکت جب اپنی ترقی کا راستہ مسدود پائے گی تو اس کے باشندے جو اپنے مالدار پڑوسیوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ جنگ جو ہیں حملہ آور پیش دستی کریں گے۔ بنگال سے ملی ہوئی آسام کی مسلم مملکت کی معاشی حالت بھی ناموافق ہوگی۔ اس کے پاس کوئی اہم معدنی وسائل نہیں ہیں۔ اس لئے تقسیم شدہ سلطنت ہند میں اس کی حالت بنگال سے بھی زیادہ ناگفتنی ہو جائے گی۔ چاہے تقسیم ہو یا نہ ہو، پنجاب کشمیر اور مغرب کی دوسری مسلم مملکتوں کی معیشت میں کسی طرح کی تبدیلی نہ ہو سکے گی۔ یہ جیسی آج گلہ بانی اور زراعت کا کام کر رہی ہیں ایسی ہی آئندہ بھی کرتی رہیں گی اور ہندوستان کے باج گذار علاقے کی حیثیت سے زندگی گذارتی رہیں گی۔ اگر ہندوستان کو خالص مذہبی بنیاد پر تقسیم کیا گیا تو تمام پاکستان اسی باج گذارانہ حیثیت پر قناعت کرنے کے لئے مجبور ہوگا۔

اس سوال کا ——————— کہ آیا مسٹر جناح ان حقائق کو تسلیم کرلیں گے یا ان پر غور و خوض کرنا ملتوی کرتے رہیں گے کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ جو بیان حال میں، ہربرٹ ایل میتھیو کو انھوں نے دیا ہے اور جو نیویارک ٹائمس میں ۱۶ ستمبر ۱۹۴۲ء میں چھپا ہے اس میں انھوں نے اشارۃً کہا تھا کہ "افغانستان ایک غریب ملک ہے لیکن وہ اپنا کام چلا رہا ہے۔ اسی طرح عراق بھی اپنا کام چلا لیتا ہے جس کی آبادی ہماری سات کروڑ آبادی کے مقابلے میں نہایت ہی مختصر ہے اگر ہم آزادی کی خاطر کفایت شعاری اور غریبی کی زندگی گذارنے کے لئے تیار ہیں تو ہندوؤں کو اس پر کیوں اعتراض ہے؟ ہماری معاشی حالت وقت گذرنے پر خود ہی سنبھل جائے گی"۔۔۔۔۔۔۔۔

دوسرے مقامات کی طرح، بڑے پیمانے کی صنعتی ترقی کا دباؤ سلطنت ہند میں بھی اتحاد کا طلب گار ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سلطنت ہند بڑے پیمانے کی صنعتی ترقی چاہتی ہے؟ ......

سلطنت ہند کے صنعتی مستقبل سے دلچسپی مسٹر گاندھی کو مسٹر جناح سے بھی کم ہے ہماری اس رپورٹ میں مسٹر گاندھی کے نقطہ نگاہ کے تجزیے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن ہم ابھی تک یہ یقین نہیں کر سکے ہیں کہ مسٹر گاندھی نے اپنے دستی کتائی کے پروگرام کو ایک مبنی بر واقعیت معاشی پالیسی کے طور پر پیش کیا ہے یا اسے انھوں نے ایک علامت کے طور پر پیش کیا ہے جس سے سلطنت ہند کی موجودہ بنیادی ضرورتوں کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے یعنی اس کی اس ضرورت کا کہ اس کی معیشت کو کافی بالذات ہونا چاہیے اس کی اس ضرورت کا کہ اسے دیہات کی مختصر جماعت کی ترقی اور بہبود کی طرف سے غفلت نہیں کرنا چاہیے۔

سلطنت ہند کے دیہات کی ان چیزوں میں جنھیں ایک شخص چاہے اس کا نقطۂ نگاہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، مشکل سے نظر انداز کر سکتا ہے وہاں کا افلاس ہے۔ اس بات پر بڑی حد تک ایک عام اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسئلے کا کوئی ایسا حل کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جو اس مایوس کن افلاس کو کم کرنے کی امید نہ دلا سکے جس میں ہندوستان کے کروڑوں آدمی مبتلا ہیں اس افلاس کو کم کرنے کی ایک امکانی صورت یقیناً یہ ہے کہ استعمال کی چیزوں کو بڑے پیمانے پر تیار کیا جائے تاکہ ان کی قیمت کم ہو اور لوگوں کی قوت خرید میں اضافہ ہو۔ بڑے پیمانے کی صنعت کو اگر افلاس کا تیر بہدف علاج نہ بھی سمجھا جائے تو بھی کم سے کم اسے اس کے علاج کا ایک ایسا ذریعہ تو سمجھا ہی جا سکتا ہے جس سے اگر اس کی پسندیدگی کو تسلیم کر لیا جائے کام لینا ممکن ہے۔

جنگ نے سلطنت ہند میں بڑے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کا بہت موقع فراہم کر دیا ہے صنعتی ترقی دنیا میں ابھی تک اپنی ابتدائی منزل میں ہے لیکن اس سرکش جن کا جتنا تجربہ آدمی کو ہوا ہے جس میں سے کچھ فیض بخش ہے اور کچھ ظالمانہ اس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ جن ایک

دفعہ قید سے رہا ہو جاتا ہے تو پھر اُسے دوبارہ بوتل میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ سلطنتِ ہند میں مشین کی ترقی کے لئے نہ صرف کوئلہ اور لوہا موجود ہے بلکہ اس کے پاس اس آخری وسیلۂ دولت کی بھی فراوانی ہے جس پر تمام مشینوں کا دارومدار ہے یعنی انسانی طاقت۔ پھر ہندوستان کی اس بے شمار انسانی طاقت کی ممتاز ترین خصوصیت مغرب کے لوگوں کی نگاہ میں یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کا خرچ فی کس (معیارِ زندگی) بہت کم ہے یا مختصراً یوں کہئے کہ اس ملک میں افلاس و محرومی بہت زیادہ ہے۔ اس لئے جو قدرتی وسائل یہاں موجود ہیں، جتنی انسانی طاقت یہاں پائی جاتی ہے اور سلطنت ہند کے لوگوں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی جتنی ضرورت ہے۔ ان سب باتوں کی موجودگی میں یہاں، بڑے پیمانے کی صنعت کی ترقی ناگزیر سی معلوم ہوتی ہے۔

لیکن اس بات کا تعین کہ سلطنت ہند میں بڑی صنعت کی ترقی نسبتاً آسانی کے ساتھ ہوگی یا مشکل کے ساتھ۔ اس کے اس فیصلے کے ذریعے ہوگا کہ اس کا سیاسی مستقبل کن شرائط کے ماتحت طے کیا جائے۔ جنوبی امریکہ کی "نئی" لیکن مالی حیثیت سے کمزور ریاستوں کے تجربے سے سلطنت ہند کے لوگوں کو سبق لینا چاہئے۔ ایسی "نئی" قوموں کو جب ان کے یہاں صنعتی ترقی کا عمل جاری ہوتا ہے اور انھیں سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اُسے نجی سرمایہ داروں سے حاصل کرنے کے لئے مجبور ہوتی ہیں اس کی بہت گراں قیمت مراعات اور حقوق کی صورت میں ادا کرنا پڑتی ہے۔ ایک متحدہ مملکتِ ہند کے لئے دوسری حکومتوں کی ہمدردی حاصل کرنے میں اور بین الاقوامی نظام کے ماتحت ان شرائط پر قرض لینے میں جن پر چین قرض مانگے گا، سہولت رہے گی لیکن ایک ایسی مملکتِ ہند اور اس سے بھی زیادہ ایسی دو ہندوستانی مملکتیں جو اپنی نئی حاصل کی ہوئی خودمختاری اور اقتدارِ شاہی سے یہ کام لیں گی کہ اپنے قومی حدود کے گرد محاصل درآمد کی ایک چہار دیواری کھڑی کریں گی۔ ان کو روپیہ قرض دینے میں سرمایہ دار زیادہ خطرہ محسوس کریں گے، اور اس پر ایک سٹہ باز کے برابر شرح منافع کے طلب گار ہوں گے۔

پھر اس مسئلے کا ایک اور دوسرا پہلو بھی ہے۔ جب ایک دفعہ بڑے پیمانے کی صنعت کو ترقی دینے کا کام، مملکت ہند بہ طور فیصلہ شدہ پالیسی کے اختیار کرے گی تو اس کے سامنے یہ مسئلہ ہوگا کہ اس پروگرام کو وہ کس طرح اپنے قابو میں رکھے کہ اس سے بعض چند آدمیوں کو فائدہ پہنچنے کی جگہ کل قوم فائدہ اٹھا سکے۔ یہی وہ جانا پہچانا مسئلہ ہے جس نے مغربی قوموں کو ایک صدی سے پریشان کر رکھا ہے اور جو بلاشبہ ہندوستان کی موجودہ سیاست کا بھی ایک لازمی جزبن چکا ہے۔ اگر مملکت ہند ٹکڑوں میں بٹ گئی تو اس ناگزیر مسئلے کا حل کرنا تکلیف دہ ہو جائے گا۔ متحدہ ہندوستان میں یہ مسئلہ ایک مہمیز کا کام دے گا اور ملک کو اس بات کے لئے اکسائے گا کہ وہ ایک بلند تر جماعتی نقطۂ نگاہ سے چیزوں کو دیکھے اور یہی بات اس کے ملکی اور غیر ملکی بہی خواہ چاہتے ہیں۔

پھر اپنے کوئلہ، لوہے اور انسانی طاقت کے بل پر مملکت ہند کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ چین کے ساتھ ایشیا کی رہنمائی کے کام میں شریک ہو سکے بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایشیا کی صنعتی ترقی میں اس کا مرتبہ سب سے زیادہ نمایاں اور بلند ہو۔ خارجی تمام عامل اس کو متحد رہنے کے لئے اتنا ہی مجبور کر رہے ہیں جتنا کہ اس کے معاشی وسائل کی منطق اسے مجبور کر رہی ہے۔ اس کی مشرقی سرحد پر بدھ مذہب کا ماننے والا برما کا ملک ہے جو ایک قوم بننے کا حوصلہ کر رہا ہے۔ برما سے مملکت ہند کو نکل، ٹین، ٹنگسٹن، سیسہ، جست اور غالباً پٹرولیم کے حاصل کرنے کی ضرورت رہے گی اور برما سے تعلقات قائم کرنے میں متحدہ مملکت ہند منقسم شدہ مملکت ہند کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ثابت ہوگی۔ جب چین وزنی دھات کی صنعتوں کو شمال مشرق کے کوئلے کے اشتراک سے ترقی دینا چاہے گا تو اپنے ساحلی علاقوں میں اس کے لئے ہندوستان کے لوہے کی کچ دھات (جو پانی کی راہ سے چین بھیجی جا سکے گی) نقل وحمل کے لحاظ سے سب سے آسان اور لاگت کے لحاظ سے سب سے کم خرچ ثابت ہوگی۔ لیکن چین اور ہندوستان کے ان باہمی انحصار رکھنے والے وسائل کو ترقی دینے سے پہلے ان پابندیوں کو ختم کرنا ہوگا جنھیں برطانیہ

کی موجودہ شہنشاہیت پسند پالیسی نے عاید کر رکھا ہے۔

اس رپورٹ کا یہ کام نہیں ہے کہ سلطنت ہند اور برطانیہ عظمیٰ کے درمیان باہمی سمجھوتے میں جو تاخیر ہو رہی ہے اس کی ذمہ داری کو متعین کرے نہ اس کا یہ منشا رہے کہ ہندوستان کی قوموں کے نزدیک مذہبی قدروں کی جو اہمیت ہے اس کو کم کرکے دکھلائے اس میں تو صرف اس بات پر غور و توجہ کی گئی ہے کہ معدنی وسائل کے نقطۂ نگاہ سے سلطنتِ ہند کے ہندو اور مسلم علاقے ایک دوسرے کے ساتھ نہایت قریبی طور پر گتھے ہوئے ہیں۔ اور معاشی لحاظ سے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ اس رپورٹ کا یہ پرزور دعویٰ ہے کہ جہاں معاشی باہمی انحصار اس قدر قریبی اور ناگزیر طور پر موجود ہو وہاں سیاسی باہمی انحصار ہی مسئلے کا عقلمندانہ حل ہو سکتا ہے۔ اس میں یہ بات بھی دکھلائی گئی ہے کہ اگر مذہبی بنیاد پر سلطنتِ ہند کی تقسیم کی گئی تو اس میں ہندو علاقوں کے مقابلے میں مسلمان علاقے زیادہ نقصان میں رہیں گے اور آخر میں اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ سلطنت ہند کی معیشت بصورت مجموعی ایشیا کے دوسرے حصوں کے ساتھ بھی باہمی انحصار کے رشتے میں منسلک ہے

چین کے رہنماؤں نے اس بات کو تسلیم کرکے تدبر اور سیاست دانی کا ثبوت دیا ہے کہ ان کے جنوب کے پڑوسی کا مضبوط و متحد رہنا ان کے فائدے کا موجب ہے۔ اسی بات کو سلطنت ہند کے اندر، ہندوؤں اور مسلمان دونوں کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ اسی میں دراصل دونوں کا فائدہ ہے۔

امام عبیداللہ ابن الاسلام سندھی

ذیل کا مقالہ علامہ موسیٰ جار اللہ صاحب نے شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی خدمت میں اشاعت کے لئے ارسال فرمایا تھا۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے ہم اس کے ساتھ علامہ موصوف کا وہ خط بھی شائع کر رہے ہیں جو صاحب موصوف نے عربی زبان میں ڈاکٹر ذاکر صاحب کو لکھا تھا۔ (مدیر)

بسم اللہ

شیخ الجامعہ الملیہ الاسلامیہ الاستاذ الکریم الدکتور الحکیم مولانا ذاکر حسین صاحب، السلام علیکم وعلی السادۃ الکرام اساتذۃ الجامعہ وعلی کل التلامذۃ سلام دعاء وتحیۃ واحترام

متع اللہ بحیاتکم وبرکاتکم وبکل مساعیکم الاسلام واھلہ۔

ارسل الیکم ھذہ الاوراق الستۃ التی کتبتھا بالعربیۃ فی شأن الامام عبید اللہ بن الاسلام السندی وترجمھا الی اللغۃ الھندیۃ مدرس یتقن اللغۃ العربیۃ ۔ واظن ان الترجمۃ جارت موافقۃ مطابقۃ للاصل وصحیحۃ فی الادب الھندی فان رأیتم فی نشرھا فائدۃ ومصلحۃ فلکم ان تنشروھا فی مجلتکم او فی غیرھا من المجلات الھندیۃ۔

لکم الخیار فی النشر وعدمہ وعلی الثانی ان تردوھا الیّ۔ والعنوان

Bhopal Shish Mahal

Musa Bey

بالشکر والاحترام — موسیٰ جار اللہ

۱۹۴۴:۹:۲۷ ،

فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً

انشاء اللہ

امام مجاہد و مجتہد مولانا عبید اللہ سندھی نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے پروردگار کی طرف ہنسی خوشی، نفس مطمئنہ کے ساتھ واپس ہوئے۔ اللہ تعالے مرحوم کو اپنے "عباد" میں شامل اور اپنی جنت میں داخل فرمائے۔

مولانا سندھی کے اعتقاد کے بموجب، سورۃ البلد کی آیات کریمہ میں "عبادی" سے مراد "ملاء اعلیٰ" ہے "مَا كَانَ لِيَ مِنۡ عِلۡمٍ بِالۡمَلَاِ الۡاَعۡلٰٓى اِذۡ يَخۡتَصِمُوۡنَ" سورہ صاد (۶۹) اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب "ملاء اعلیٰ" کو "حظیرۃ القدس" کے نام سے موسوم فرماتے ہیں، اور فلسفہ ولی اللہی میں "حظیرۃ القدس" کا اعتقاد ایک بنیادی اور اساسی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہ کے فلسفہ میں "حظیرۃ القدس" کا کام وہی ہے جو حکمائے یونان کے فلسفہ میں "عقل عاشر" کا کام ہے۔ فیوض الٰہی میں سے ہر فیض جو عالم انسانیت پر نازل ہوتا ہے وہ حظیرۃ القدس کے " واسطہ سے نازل ہوتا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی (خدا ان کو اپنے عباد میں شامل اور اپنی جنت میں داخل فرمائے) اکثر و بیشتر "حظیرۃ القدس" کا ذکر فرمایا کرتے تھے، اور جب کبھی "حظیرۃ القدس" کا ذکر فرماتے تو اس وقت ان کی نماز دلی، خوشی بن کر، ان کے چہرے سے نمودار ہوتی۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ یقین کر رہے ہیں کہ جب کبھی خدائے تعالے ان کو اپنی طرف ہنسی خوشی لوٹنے کا حکم دے گا تو ضرور ان کو اپنے بندوں میں شامل اور اپنی جنت میں داخل فرمائے گا اور ان کی جائے استقرار، "ملاء اعلیٰ" یعنی حظیرۃ القدس " میں ہوگی۔

پس خدائے کریم نے نہ اپنے سچے وعدے کے خلاف فرمایا اور نہ ذرہ برابر اپنی مقرر میعاد کے خلاف کیا۔ کیونکہ خدائے بزرگ نہ کسی عامل کے عمل کو ضائع کرتا ہے اور نہ کسی امیدوار کی امید کو۔ وہ اپنی کتاب کریم میں فرماتا ہے: "یَا أَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِی إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِی فِی عِبَادِی وَادْخُلِی جَنَّتِی"۔

ہمیں قرآن کریم کے ارشاد کے بموجب خدا کے فضل سے اُمید ہے کہ اس نے مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دی اور اپنے عباد میں شامل اور اپنی جنت میں داخل فرمایا۔ اور ملاءِ اعلیٰ یا حظیرۃ القدس کو مرحوم کی جائے قرار بنایا۔

ہمیں امید ہے کہ امام عبید اللہ سندھی نے، اپنی حیاتِ ابدی میں، اپنے خدائے کریم سے اس انعام کو پالیا جس کے وہ آرزومند تھے۔ "وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیمُ"۔

میں، مولانا سندھی سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ میں نے پہلی مرتبہ مرحوم کو اس وقت دیکھا تھا جبکہ وہ لینن کی زندگی میں، روس کے دار السلطنت، ماسکو میں تشریف لائے تھے اور اعیانِ حکومت نے ان کا استقبال کیا تھا۔

حکومت بالشویک، مولانا کا بہت زیادہ احترام کرتی تھی اور ان کے افکار و خیالات سے استفادہ کرتی تھی۔ چنانچہ حکومت نے مولانا کے بعض ارشادات انگریزی زبان میں طبع کرائے۔ میرے پاس اس کا فارسی نسخہ باقی رہ گیا ہے۔

میں بھی ماسکو پہنچا تاکہ مولانا کا استقبال کروں اور آپ کی زیارت سے استفادہ کروں۔ میں مولانا کی صحبت میں، بہت روز تک رہا۔ اور خود مولانا بھی اکثر و بیشتر، صبح و شام میرے گھر تشریف لایا کرتے تھے۔

پھر مولانا کو میں نے روس کے دوسرے بڑے شہر لینن گراڈ میں مدعو کیا۔ مرحوم نے حکومت سے اجازت طلب کی اور پھر آپ اپنے نوجوان ہندوستانی دوستوں کی ہمراہی میں، جو روس کے کالجوں کے طالب علم

تھے لینن گراڈ تشریف لائے۔ میں نے ان کا استقبال کیا اور حکومتِ روس کی طرف سے بھی استقبال کیا گیا۔ مولانا مرحوم نے میرے مکان پر ٹھہرنا پسند فرمایا۔ اور میرے گھر کو ماہِ رمضان میں دو ہفتے تک اپنے قیام سے مشرف فرمایا۔

مولانا سندھی، یا آپ کے ساتھیوں میں سے کسی شخص نے بعد از سفر روزے قضا نہیں کئے میری رفیقہ حیات معزز مہمانوں کے واسطے، چائے، دوپہر اور رات کا کھانا، افطاری اور سحری تیار رکھتی تھیں۔ مگر میں نے اُن میں سے کسی کو روزہ قضا کرتے نہیں دیکھا۔ دسترخوان بچھے رہتے تھے اور اُن پر ہر قسم کے لذیذ اور پاک و صاف ماکولات و مشروبات چنے رہتے تھے۔

افطار کے وقت مولانا سندھی کھانے کی لمبی میز پر تشریف لائے اور اُن کے ساتھ ان کے دوست ہوتے اور بعض اوقات روس کے بڑے بڑے علماء بھی ہوتے تھے جو آپ سے ملنے اور تبادلہ خیال کے لئے آیا کرتے تھے۔

مولانا سندھی اور آپ کے ساتھیوں نے لینن گراڈ کی خوب سیر کی اور ہر وہ چیز دیکھی جو شوقین سیاحوں کا مطمع نظر ہو سکتی تھی۔ علاوہ ازیں آپ نے بہت سی ایسی چیزیں بھی دیکھیں جن کو کم ہی لوگ دیکھتے ہیں۔

مولانا کا جتنے روز تک میرے مکان پر قیام رہا میں ہر وقت اُن کے ساتھ رہتا تھا اور سوائے آپ کے آرام کے اوقات کے یا اس وقت جبکہ وہ اپنے دوستوں سے ملتے تھے، میں کبھی مرحوم سے جدا نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں مولانا کو خوب جانتا ہوں۔ مولانا ایک سچے اور مخلص حنفی المذہب تھے نہ آپ کے کیرکٹر اور گفتگو میں کسی قسم کی بناوٹ، تصنع یا تکلف دیکھا۔

اپنے علم میں وہ بہت بڑے مجتہد اور اپنی تحریکات و اعمال میں، ایک عظیم الشان مجاہد تھے مولانا کی بہت سی آرزوئیں اور اُمیدیں تھیں جن کے پورے ہونے کی ان کو کامل توقع تھی۔

مولانا مرحوم ۱۹۲۳ء میں روس سے واپس ہوئے، پھر ۱۹۲۶ء میں میری اور ان کی ملاقات استامبول میں ہوئی۔ نیز حرمین میں مجھ کو اُن سے بارہا شرف ملاقات حاصل ہوا۔ حرم مکی

میں کئی ماہ تک میں اُن کے ساتھ رہا اور اس اثنا میں مولانا سندھی نے قرآن کریم کی تفسیر شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفے کے مطابق مجھ کو املا کرائی۔ اور میں نے نہایت اہتمام سے اس کو مدوّن کیا۔ اسی زمانے میں، مجھ کو مولانا کے اجتماعی اور سوشل خیالات و افکار، نیز قرآن کریم کے متعلق اُن کے حکیمانہ عزائم و مقاصد پر واقف ہونے کا کافی موقع ملا۔

بعض اوقات، حضرت، قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کو پڑھتے "قُلْ یَاأَیُّهَا النَّاسُ إِنِّی رَسُولُ اللّٰهِ إِلَیْكُمْ جَمِیعًا" (۷ : ۱۵۹) فرماتے کہ اگر ہم قرآن کریم کی تفسیر، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفے کے مطابق کریں تو خدا کے اس فرمان کو، ہم موتمر ادیان و مذاہب میں ہر دین کی کتاب سے ثابت کر سکتے ہیں۔

حضرت مولانا سندھیؒ کے نزدیک، ان کی مہتم بالشان آرزوؤں کی تکمیل کا اولین طریقہ اور ابتدائی تدبیر یہ تھی کہ اُمت اسلامیہ کے بچوں اور بچیوں کی کامل تربیت، اسلامی اور عصری اصول کے مطابق مسلمانوں کی بہترین اسلامی درسگاہوں اور عالم تمدن کی اعلیٰ جامعات میں کرائی جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت مولانا نے جو سب سے پہلا اقدام کیا وہ یہ تھا کہ دہلی اور لاہور میں آپ نے "دار الحکمہ" کی ایک چھوٹے نمونے پر (Miniature Model) تاسیس کی اور ان کی آرزو تھی کہ اس کو اپنی زندگی میں، تمام کرۂ ارض کی بہترین یونیورسٹی دیکھیں جو اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ، عہد حاضر کے کائناتی اور اجتماعی علوم کی تعلیم کا واحد مرکز ہو۔

حضرت مولانا سندھی کی وفات، نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ تمام عالم اسلام کے لئے ایک عظیم الشان خسارہ ہے۔

لہٰذا اُمتِ اسلامیہ کے علما، امرا اور دولت مندوں کا فرض ہے کہ مولانا سندھی کی آرزوؤں کو اُن کی یادگار قائم کر کے زندہ کریں اور قرآن کریم کے اس ارشاد کو نہ بھولیں مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیَاةً طَیِّبَةً، سورۂ نحل

اس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ مسلمانوں کے چندوں اور عطیوں سے مولانا سندھی کی یادگار کے واسطے

Imam Sindi Memorial Fund

کے نام سے ایک فنڈ کھولا جائے اور جب کافی رقم جمع ہو جائے تو اس کو امتِ اسلامیہ کے بچوں اور بچیوں کی اعلیٰ اسلامی اور عصری تربیت کے انتظام میں صرف کیا جائے۔

اگر وہ مر چکے تو اب ہم کو ان کے جانشین پیدا کرنا چاہئیں۔ جن سے اسلام اور ملتِ اسلام کی زندگی وابستہ ہے

مسلمانو! قرآن کریم کو اپنے ملک میں مہجور و متروک مت ہونے دو۔

موسیٰ بک

انوکھا سبق

چیخوف مشہور روسی افسانہ نویس نے اپنے بچپن کی اس کہانی میں مروجہ طریق تعلیم اور اس کے عاملین پر دلچسپ انداز میں طنز پیش کیا ہے بلی کا ایک بچہ خونخوار درندوں کی شاندار نسل کا ایک نمائندہ ستارہ جس کی فطرت میں چوہے کا شکار کرنا ودیعت کیا گیا ہے غلط تعلیم کا شکار ہو کر ایک ننھی سی چوہیا سے کانپنے لگ جاتا ہے اس کی روح اک چھچھوندر کی سرسراہٹ سے فنا ہونے لگتی ہے۔

خدا جانے ہمارے اداروں کے کتنے بچے مدرسہ کی غلط تعلیم سے ہی نہیں بلکہ گھر کی تادیب سے سماج کی تربیت سے مدرسہ چھوڑنے تک اپنی شخصیت کا اتنا کچھ کھو چکے ہیں کہ ان کی روح اک چھچھوندر کی سرسراہٹ سے نہیں بلکہ پرچھائیوں اور سایوں کی جھلک سے لرز اٹھتی ہے اور بیشتر اوقات تو کوئی ایسی روح ہی باقی نہیں رہی جسے لرزنے کا اندیشہ ہو!

ہم نے پنسل کوڈ سے نہیں بلکہ تعلیمی کوڈ کی امداد سے استاد کا ہاتھ روک لیا ہے لیکن دنیا کا کوئی قانون بچپن کی کونپلوں پر استاد کی شخصیت کے گہرے سایہ کو پڑنے سے نہیں روک سکتا۔ کوئی پابندی اس کے کانوں کو سماج کے بندھنوں کی جھنکار سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ نئے تعلیمی انقلاب کے لئے استاد نہیں بلکہ پورے سماج کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی بچہ مدرسے میں آکر اک دقت طلب مسئلہ ہو کے رہ گیا ہے تو یقیناً اس بھیانک تصویر کے پس منظر میں ان کے ابا جان خاندان میں اس سے بھی زیادہ حل طلب مصیبت بن کر صرف رہ ہی نہیں چکے بلکہ اب تک ہیں۔

بلی کا بچہ بے زبان تھا مگر خوف نے اس کی بیکسی اور مظلومیت کے اظہار کو زبان عطا کر دی تھی گمراں بازبان حیوان ناطق کے بچوں کے لئے جن کا المیہ روزانہ مدرسے ہی میں نہیں خاندان اور سماج، بازار اور تفریح گاہوں میں کھیلا جاتا ہے ابھی ایک مویسے کی ضرورت ہے

میرے چچا مدرسہ جانے کو تیار ہو رہے تھے لاطینی گرامر کی کتاب جو اٹھائی تو کیا دیکھتے ہیں جلد کا ایک کونا چوہوں نے کتر ڈالا غصہ میں بھنا کر سیدھے باورچی خانے میں گھس گئے اور ماما سے بولے یہ ہمارے یہاں اتنے چوہے کہاں سے آگئے۔ غضب خدا کا! کل میری ٹوپی کتر گئے آج لاطینی گرامر کا ستیاناس کر ڈالا اس حساب سے تو چند دن میں کپڑوں تک کو چٹ کر جائیں گے۔

"تو بھلا میرا کیا قصور ہے۔ میں تو انہیں کہیں سے نہیں لے آئی"

"تم نہیں لائیں تو تمہاری روٹیوں کے ٹکڑے لائے ہوں گے۔ اچھا اب ان کا کچھ انتظام تو ہونا چاہیے کہیں سے کوئی بلی تلاش کرو کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"میاں بلی تو میرے پاس بھی موجود ہے پر اس کا ہو گا کیا؟" ساتھ ہی اس نے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ چچا نے جو گھوم کر دیکھا تو وہاں ایک سیخ کا سا پتلا دبلا بلی کا بچہ جھاڑو کے پاس گٹھی بنا اونگھ رہا تھا۔

"کیوں؟ یہ کام نہ دے گا"

"یہ تو ابھی بچہ ہے۔ دو مہینہ کا بھی نہ ہو گا"

"ہوا کرے۔ ہم خود سکھا لیں گے۔ یہاں کونے میں پڑے رہنے سے تو یہی بہتر ہو گا کہ کوئی کام کی بات سیکھے۔ یہ کہہ کر چچا نے پریشانی کے عالم میں ایک آہ بھری گویا دنیا بھر کو کام کی باتیں سکھانے کی ذمہ داری اللہ میاں نے انہی کے شانوں پہ ڈال دی تھی اور حیوانوں کی انہوں نے خود اپنے سر لے لی تھی۔

بلی کے بچے نے سر اٹھایا کچھ دیر اونگھتے ہوئے ان کے پیچھے دیکھتا رہا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اسکول سے واپسی پر چچا بازار سے ایک چوہے دان خرید لائے ایک بغل میں کتابوں کا بلندہ اور دوسری میں چوہے دان۔ بدن قدرے آگے کو جھکا ہوا۔ دور سے معلوم ہوتا تھا گویا کوئی پرندہ اک عقابی اڑان لینے کو زمین سے اٹھا چاہتا ہے اور دونوں پر اسی انداز سے کھولے ہے۔

شام کے کھانے کے بعد چوہے دان کے تکلے میں روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹکا دیا اور تیار کر کے اسے چچا جان کے سرہانے رکھ دیا گیا۔ یہیں جہاں طلبا کی پرانی کاپیوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا انھیں ماما کبھی کبھار ضرورت کے وقت گھر کے کام میں لے آتی تھی۔

چھ بجے شام جب چچا جان بیٹھے ہوئے بچوں کی املا کی کاپیاں درست کر رہے تھے تو دفعتاً کھٹاک سے آواز آئی۔ اتنے زور سے کہ چچا جان چونک گئے اور قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ فوراً پلنگ کے پاس پہنچے اور چوہے دان باہر نکال لیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ننھی سی انگوٹھے کے برابر چوہیا بار بار چوہے دان کے تاروں کو سونگھتی ہے اور ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہی ہے۔

"خوب آپ ہیں!" چچا جان نے عجیب طنز بھری کینہ توز نگاہوں سے اسے جانچا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے آج اسے کسی زبانی امتحان میں فیل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ آہستہ آہستہ سر ہلا کر بولے "اب تو تم پکڑی گئیں ملعون کہیں کی! ذرا ٹھہر و تو سہی تمھیں ابھی بتاتا ہوں میری گرامر کی کتاب کیسے کترتے ہیں۔"

اس اظہار طمانیت کے بعد چچا نے چوہے دان کو فرش پر رکھ دیا اور ماما کو بلایا "ماما دیکھو تو آج اک چوہیا پھنسا ہے فی الفور بلی کے بچے کو لاؤ۔"

"ابھی لائی سرکار"

ایک منٹ کے اندر اندر ماما اپنے ہاتھوں میں خونخوار شیروں کی نسل کے ایک نمائندہ کو لئے ہوئے پہنچ گئی چچا مارے خوشی کے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولے "شاباش! آج ہم اس بچہ کو پہلا سبق دیں گے۔ اسے چوہے دان سے ادھر رکھو۔ دیکھنا ادھر نہیں۔ ذرا تھوڑا سا ہٹ کر بس بس یہیں ٹھیک ہے اچھا ذرا پہلے یہ چوہے دان کو سونگھ تو لے اور چوہیا کو دیکھ تو لے"

بلی کے بچے نے پہلے تو کچھ تعجب سے میرے چچا کو دیکھا پھر آرام کرسی پر نگاہیں جما دیں اس کے بعد کچھ دیر گھبراہٹ میں چوہے دان کو سونگھتا رہا اور دفعتاً! یا تو لیمپ کی چندھیا دینے والی روشنی سے ڈر گیا یا شاید اس توجہ کی تاب نہ لا سکا جو برابر ہر جانب سے اس پر دی جا رہی تھی ایک بارگی لپکا اور بے حد خوف زدہ انداز میں دروازے کی طرف بھاگا۔

چچا جان نے حیرت انگیز پھرتی سے اس کی دم تھام لی اور چلائے "روکو! اس بدمعاش کو روکو! (گویا اب بھی روکنے کی ضرورت تھی) نالائق ایک چوہے سے ڈرتا ہے۔ ارے گدھے دیکھتا نہیں یہ تو محض ایک چوہا ہے آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کیا؟ (داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت کو غصہ کے انداز میں ہلا کر) میں تم سے دوبارہ کہتا ہوں ذرا آنکھیں تو کھول کر دیکھو"۔

یہ کہہ کر چچا جان نے بچے کو گود میں پکڑا اور اس کی ناک چوہے دان کی تاروں سے بھڑا دی۔ "دیکھ دیکھ اب بے تھرڑے ذرا دیدے کھول کر دیکھ۔ ماما ذرا اسے تھام لو اور چوہے دان کی کھڑکی سی مقابل لئے رہو اور دیکھنا جونہی میں کھڑکی کھولوں تم فوراً اسے چھوڑ دینا سنتی ہو نا، فی الفور، بغیر ایک لمحہ توقف کے! اچھا خبردار!"

اس وقت چچا جان کے چہرے پر ایک پُراسرار جھلک دکھائی دے رہی تھی گویا وہ کسی المیہ اسٹیج کی تیاری میں مصروف ہیں۔ انھوں نے چوہے دان کی کھڑکی کھول دی!

چوہا پہلے تو ڈرتی ڈرتی باہر نکلی۔ ننھی سی ناک سے ہوا کو سونگھا اور پھر نا معلوم کیوں، تیر کی طرح الماری کے نیچے گھس گئی۔ ادھر بلی کا بچہ چھٹتے ہی میز کے نیچے تھا اور اس کی دم مارے خوف کے ہوا میں کھیل رہی تھی۔

چچا غصے میں سرخ ہو کر بولے "اوہو، لینا لینا! نکل بھاگا! صاف بچ نکلا! کہاں ہے، وہ بدمعاش ہے کہاں۔ کیا بکس کے پیچھے ہے۔ (دائیں ہاتھ کو غصے میں جھٹکے سے ہلاتے ہوئے گویا کسی خیالی دشمن کے ٹھونگا لگا رہے ہیں) ذرا ٹھہرو تو سہی ....

چچا نے بچے کو میز کے نیچے سے گھسیٹ کر باہر نکالا اور گردن سے پکڑ کر اونچا اٹھایا۔ کان پر زور سے تھپڑ لگاتے ہوئے "ملعون اور ڈرے گا! پھر دوبارہ ایسا کرے گا زندہ نہیں چھوڑوں گا بدمعاش کہیں کا"۔

دوسرے دن چچا جان نے مار مار کر پھر بلایا اور بولے "دیکھو آج ایک اور چوہا پھنس گیا ہے بلی کے بچے کو ادھر لاؤ"۔

کل کے حادثے کے بعد بچہ کارنس کے پیچھے آتش دان میں گھس گیا تھا اور مارے خوف کے ساری رات باہر نہ نکلا جب ماما نے اسے کھینچ کر باہر نکالا اور گردن سے پکڑ کر چوہے دان کے سامنے کھڑا کیا ہی تو وہ مارے

ڈر کے تھر تھر کانپ رہا تھا اور ترحم انگیز انداز میں میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔ چچا جان اس کی یہ حالت دیکھ کر کچھ نرم ہوتے۔ بولے "اسے دم بھر کے لئے سستا لینے دو یہی کہ یہ پہلے چوہا کو دیکھ لے اور سونگھ لے (بچے کی طرف دیکھ کر) شیر کے خالو ادھر دیکھو اور اپنا کام سیکھو۔ ارے دیکھتے ہوئے کہ بچہ چوہے دان سے گھبرا کر پیچھے ہٹنے کی کوشش کر رہا ہے، خدا تمھیں غارت کرے (غصے میں تمتا کر) میں تمھیں وہ مار ماروں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گے۔ اسے کان سے پکڑے رہو، ٹھیک ٹھیک، ایسے ہی۔ اچھا اب اسے چوہے دان کے سامنے کھڑا کر دو"

اس کے بعد چچا نے آہستہ سے چوہے دان کی کھڑکی کھولی چوہا بلی کے بچے کی ناک کے نیچے سے صاف نکل گیا اور تیسری میں خادمہ کے ہاتھ سے جا ٹکرایا اور وہاں سے الماری کے پیچھے غائب! ادھر بلی کے بچے نے اپنے آپ کو آزاد پا کر جو ایک جان توڑ جست لی ہے تو سوفا کے نیچے

ہائے غضب دوسرا چوہا بھی گیا۔ تم اسے بلی کہتے ہو (دانت پیس کر) اس کا علاج تو محض ڈنڈا ہی ڈنڈا اور جوتے۔ اسے تو اسی چوہے دان کو پٹنا چاہئیے۔

جب تیسرا چوہا پکڑا گیا اور بچہ چوہے دان کے سامنے لایا گیا تو مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہا تھا اور ماما کے ہاتھ کو آہستہ آہستہ سہلاتا تھا.........

چوتھے چوہے پر تو چچا جان غصہ کے مارے آپے میں نہ رہے۔ بلی کے بچے کو زور سے ایک ٹھوکر جمائی اور کہنے لگے "اس ذلیل شے کو میری نگاہوں سے دور لے جاؤ۔ کہیں چھوڑ آؤ۔ دفع بھی کرو کمبخت کو یہ کسی مرض کی دوا نہیں"

اس پر ایک سال گزر گیا اور کمزور مریل بلی کا بچہ ایک موٹا تازہ گلچھوں والا مجھدار بلا بن گیا ایک دن یہ حضرت مکان کے پچھواڑے سے ہوتے ہوئے اپنی کسی محبوبہ سے ملنے جا رہے تھے۔ ابھی منزل مقصود تک پہنچنے نہ پائے تھے کہ راستے میں ایک آہٹ سی پائی نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ ایک چوہا نالی میں سے لت پت ہوتا ہوا بیں خانے کی طرف کو جا رہا ہے۔ بس وہیں کے وہیں ٹھٹک کر رہ گئے اور بدن کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ میرے شیر کی کمر کمان کی طرح اوپر کو اٹھ گئی اور اس کے گل مچھوں میں سے ایک عجیب و غریب قسم کی آواز نکلی اور اس کے ساتھ ہی سارے جسم پر کپکپی چھوٹ گئی۔ اس کے بعد دو تین قدم تو انھوں نے

اس احتیاط سے لئے گویا ساری زندگی کا دار و مدار انہی پر ہے اور اس کے بعد جو بھاگے ہیں تو ان کی دم پشت سے جا لگی تھی۔

میں بھی کبھی کبھی اپنے آپ کو کچھ ایسی ہی مضحکہ خیز حالت میں پاتا ہوں، بلی کے بچے کی طرح مجھے بھی ایک زمانہ میں ایسا ہی افتخار بخشا گیا تھا۔ چچا جان نے مجھے اپنے دست مبارک سے (دماغ مبارک سے نہیں) لاطینی زبان پڑھائی تھی اب بھی جب کبھی اتفاقاً کوئی اعلیٰ کلاسیکی کتاب پر نگاہ پڑ جاتی ہے تو بجائے کسی علمی تڑپ اور شوق کے مجھے لاطینی کی پنج حرفی اور شش حرفی گردانیں یاد آنے لگتی ہیں اور اس کے ساتھ چچا جان کا زرد اور ترش چہرہ..............

میں دفعتاً پیلا پڑ جاتا ہوں۔ میرے سر کے بال خوف کے مارے کھڑے ہو جاتے ہیں اور میں بھی بلّے کی طرح سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ نکلتا ہوں!

مالابار میں

مالابار کے قحط کی خبریں سن کر کملا دیوی نے وہاں کا دورہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ میں ان کی روانگی کے وقت مدراس میں تھی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ مالابار کے لاوارث بچوں کے لئے یتیم خانے کھلے ہیں اور میں دیکھنا چاہتی تھی کہ ان یتیم خانوں میں تعلیم دینے کے کچھ موقع ہیں یا نہیں۔ کملا دیوی نے مجھے اپنے سنگ لے لیا۔ سب سے پہلے ہم کالی کٹ گئے۔ کملا دیوی کے آنے کی خبر مشہور ہو چکی تھی اور اسٹیشن پر ہمارا خیر مقدم کرنے والوں کی بھیڑ تھی۔ تمام لوگ ایسے صاف سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی گھاٹ پر سے دھلی کر آئے ہیں۔ یہ سب طالب علم تھے اور ہماری جے پکارتے ہوئے ہماری قیام گاہ تک آئے۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور پہلا دن ملتے ملتے گذر گیا۔ مجھے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کا کام سال ڈیڑھ سال سے جاری ہے۔ مالابار میں قحط پڑا، پھر ہیضے کی وبا پھیلی اور دونوں نے مل کر وہاں کے معاشی نظام میں بڑی ابتری پیدا کر دی۔ لیکن غریبوں کی سیوا میں خاصی سرگرمی دکھائی گئی۔ کام کرنے والے اداروں میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی، ویشی مہلا سنگھ، پور ہوم سوسائٹی سب سے ممتاز ہیں۔ انھوں نے لوگوں میں دوائیں تقسیم کیں، یتیم بچوں کے لئے یتیم خانے کھولے مسلمانوں کے لئے الگ یتیم خانے ہیں۔ ان میں سے بھی میں نے دو تین دیکھے۔

ہمارا پروگرام اس ارادے سے بنایا گیا تھا کہ جن علاقوں میں قحط اور وبا کا زیادہ اثر پڑا تھا ان کا دورہ کریں، مگر مالابار میں نظر جہاں تک جاتی تھی قحط کے آثار کا پتہ ہی نہ چلتا تھا چاروں طرف ہرے بھرے اور پھلوں سے لدے ہوئے ناریل کے درخت جہاں بھی زمین ذرا ہموار تھی، دھان لہلہا رہے تھے بازاروں میں کیلے اور ترکاریوں کے ڈھیر لگے تھے میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہاں کا قحط کیسا ہے۔ لوگوں کو دیکھتی تھی تو وہ بھی سب صاف ستھرے تھے، ان کے چہرے ہرگز فاقہ زدہ لوگوں کے نہ تھے جب مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے حالات دریافت کئے تو مجھے بتایا گیا کہ مالابار کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے کیونکہ بہت

سے لوگ جو ملایا میں رہتے تھے بھاگ کر وطن واپس آگئے ہیں۔ اس کے علاوہ جنوبی ہند میں جو فوجیں ہیں ان کی ضروریات بھی پوری کی جاتی ہیں مالابار کی پیداوار کا بیشتر حصہ پہلے ہی بھیجدیا جاتا تھا، جنگ نے ہر چیز اتنی گراں کردی کہ مزدور، کسان اور ماہی گیر پیٹ بھر کھانے کو کچھ خرید نہ سکتے تھے۔ مالابار کا غریب طبقہ کساوے سنبھ کی روٹی اور چانول پر گذر کرتا ہے۔ کسانے کا بھاؤ ایک پیسہ سیر تھا۔ اب اس کی پیداوار بند ہوگئی ہے اور وہ مشکل سے دو روپیہ سیر ملتا ہے۔ چاول کی پیداوار پہلے بھی آبادی کے صرف ایک تہائی حصے کے لئے کافی ہوتی تھی باقی کے لئے باہر سے آتا تھا۔ یہ بند ہوگیا تو غریبوں کے لئے کھانے کو بہت کم رہ گیا۔ غذا کی کمی سے وہ کمزور ہوگئے اور مختلف بیماریاں پھیلنے لگیں۔ جون اور جولائی ۴۳ء میں ہیضہ کی سخت وبا پھیلی اس میں کوئی ۲۰ ہزار آدمی ضائع ہوئے غذا کی کمی اور بیماریوں کی شدت کسی حادثے کی وجہ سے نہیں ہوتی، جن حالات کا یہ نتیجہ تھیں وہ اب بھی موجود ہیں۔ مالابار والوں کو جو مدد پہنچائی جاری ہے وہ وقتی ہے مستقل نہیں۔ معاشی اصلاح میں دیر بہرحال لگتی ہی ہے اور اصلاح کی جو تدبیریں ہوسکتی ہیں ان پر عمل کرنا آج کل اور بھی مشکل ہے۔ مالابار کے دیہات میں کتائی کا کام شروع کیا گیا ہے اور اسے زیادہ تر لڑکیاں اور بوڑھی عورتیں کرتی ہیں۔ ان کے لئے الگ الگ مرکز بنے ہیں جن میں ۲۰۰ سے ۵۰۰ تک عورتیں کتائی کرتی ہیں ان میں ہندو مسلمان دونوں ہیں۔ بڑا سوال یہ ہے کہ جو سوت تیار ہو رہا ہے اس سے کپڑا کہاں اور کیسے بنا جائے گا جب تک اس کا مستقل انتظام نہ ہو جائے غریبوں کی آمدنی بڑھانے کی یہ تدبیر کامیاب نہیں کہی جاسکتی۔

ہم ۱۸ اکتوبر کو کالی کٹ پہنچے تھے، ۱۹ کو کتائی کا ایک مرکز دیکھنے گئے۔ راستہ بہت خوبصورت تھا۔ ایک طرف پہاڑ تھے دوسری طرف ایک گہری وادی، زمین کا قدرتی سرخ رنگ درختوں کی سبزی سے خوب میل کھاتا ہے۔ راستے میں بہت سے لوگ آتے جاتے تھے۔ بعض مالابار کی مخصوص ٹوپی پہنے تھے یہ کلاہ اور چھتری کی ایک بہت کارآمد آمیزش ہے۔ اور ناریل کی پتیوں سے بنائی جاتی ہے۔ اس قسم کی چھتریاں بھی جیسی کہ لوگ برہما میں لگاتے ہیں ناریل کی پتیوں سے بنتی ہیں اور بہت خوبصورت رنگی ہوتی ہوتی ہیں انہیں نمبودری برہمنوں کی عورتیں لگاتی ہیں یہ ان کا پردہ ہے، اس لئے وہ رات کو بھی ایسی چھتریاں لگاکر نکلتی ہیں مسلمان عورتیں پردے کے لئے معمولی قسم کی کپڑے کی چھتریاں لگاتی ہیں۔ ان سے چہرہ چھپایا نہیں جاتا۔

صرف ایک رسم کا لحاظ ظاہر کیا جاتا ہے۔ جنگ سے پہلے ہندو اور مسلمان عورتوں کے لباس میں فرق صرف یہ تھا کہ مسلمان عورتیں بہت رنگین کپڑے پہنتی تھیں ان کی کرتیوں کی آستینیں کلائی تک ہوتی ہیں، یہ ایک اور فرق ہے۔ بعض خاندانوں کی عورتیں کرتے کے اوپر کچھ نہیں پہنتی ہیں۔ شمالی ہند کے مقابلے میں یہاں عورتوں کا مرتبہ اور ان کا اختیار بہت زیادہ ہے وہ گھر اور خاندانی ملکیت کی قانوناً مالک ہوتی ہیں، اور خاندان پر پوری حکومت کرتی ہیں۔ مردوں کے لئے یہ تعریف کی بات ہے کہ انھوں نے قدیم زمانے کی حکومت مادری کی یہ نشانی قائم رکھی اور عورتوں کی ماتحتی کو گوارہ کرتے ہیں۔

مالابار میں مسجدیں اور مندر بالکل گھروں کی طرح بنتے ہیں اور باہر سے دیکھ کر انھیں پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ عمارت بیشتر لکڑی کی ہوتی ہے۔ مالابار میں ساگون کی لکڑی افراط سے ہوتی ہے اور عمارتوں میں بھی لگائی جاتی ہے۔ کالی کٹ سے دس میل دور دیہات میں میں نے ایک دو سو برس کا پرانا مکان دیکھا یہ سارا لکڑی کا تھا۔ اور لکڑی پر اس طرح جلا کی گئی تھی کہ پتھر کا دھوکا ہوتا تھا۔ مکان میں کھڑکیاں بہت تھیں اور اتنی لمبی کہ ہر کمرہ برآمدہ معلوم ہوتا تھا۔ انھیں کے ساتھ نشست کا بھی انتظام تھا۔ کھڑکیوں میں بہت ہی خوبصورت جالیاں بھی لگی تھیں۔ چھت کا بوجھ سنبھالنے کے لئے لکڑی کے سڈول گاؤدم ستون تھے۔ مکان کا فرش مٹی کا تھا جس میں کاجو کا تیل ایک خاص مقدار میں ملا یا گیا تھا اس آمیزش سے فرش بہت چکنا ہو جاتا ہے اور اتنا سخت کہ اس پر پانی بالکل اثر نہیں کرتا۔

کالی کٹ سے ہم لوگ کٹی کل گئے۔ یہاں ایک مشہور مدرسہ ہے جہاں کتھا کلی ناچ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہم لوگ مدرسے میں گئے تو دیکھا کہ ایک استاد چھ سات برس کے لڑکوں کو ناچ سکھا رہا ہے۔ ایک آدمی ڈھول بجا رہا تھا، ایک طبلہ۔ ایک کتھا پڑھ رہا تھا اور ایک قصہ کو بیان کرنے کے بھاؤ بتا رہا تھا۔ کٹی کل میں ہم نے ایک اور قسم کا ناچ بھی دیکھا جسے اوٹن دوٹی کہتے ہیں۔ اس میں ناچنے والا اپنے چہرے کو رنگتا ہے۔ اس کے پیچھے دو سازندے ہوتے ہیں جو قصہ بھی سناتے رہتے ہیں۔ ناچنے والا اسے ادا کرتا ہے مگر اس ناچ میں کوئی حسن اور نفاست نہیں ہوتی۔

کٹی کل میں زیمورن کا محل بھی ہے۔ پہلے زیمورن کالی کٹ کے راجہ ہوتے تھے، اب ان کی کوئی سیاسی

حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔ زمیورن کے خاندان کے کچھ مردوں نے کملا دیوی کو محل میں آنے کی دعوت دی اور ان کے ساتھ میں بھی چلی گئی۔ ہم کو پہلے ایک اونچی اور بہت لمبی فصیل نظر آئی جس کے سامنے خندق تھی، جیسے کہ پرانے زمانے کے قلعوں میں۔ زمیورن کا کنبہ اب کوئی ۲۰۰ خاندانوں پر مشتمل ہے اور ان کی بستی میں کوئی ۱۲۰۰ مرد عورتیں اور بچے ہوں گے۔ ہم پھاٹک سی فصیل کے اندر آئے تو ہم نے دیکھا کہ ایک لمبے چوڑے احاطے کے اندر بستی سی بسی ہے۔ محل کی طرح کی کوئی عمارت نہیں۔ دروازے کے ایک طرف مندر تھا، اور اس کے آگے عمارتوں کے بیچ میں دو ہال، ہم پہلے ایک ہال میں داخل ہوئے جو کسی زمانے میں زمیورن کا دیوان عام ہوگا۔ پھر دوسرے ہال میں گئے یہاں بہت سی عورتیں جمع تھیں اور بیشتر اپنے قومی لباس میں تھیں۔ یعنی صرف ایک تہمد باندھے تھیں۔ خاندان کی سردار ایک بہت بوڑھی عورت ہے یہ ایک لکڑی کے بنچ پر بیٹھی تھی لیکن آن بان اور لب ولہجہ شاہانہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم لوگ کون ہیں اور کیسے آئے ہیں، لیکن جب کملا دیوی کا باقاعدہ تعارف کرایا گیا تو اس نے پوچھا "کملا دیوی کون ہے؟" جب اس کا جواب دیا گیا تو اس نے پوچھا "یہ یہاں کیوں آئی ہے؟" دربار کی یہ رسم ادا کر دی گئی تو دوسری عورتوں نے ہمیں گھیر لیا اور باتیں کرنے لگیں۔ انہوں نے ہندی کتابوں سے پڑھی تھی، کسی کو ہندی بولتے سنا نہیں تھا انھوں نے ہم سے فرمائش کی کہ ہم سے ہندی بولئے مگر ہم نے جو کچھ کہا اس کا ایک لفظ وہ نہیں سمجھیں۔ معلوم نہیں وہ ہندی کے نام سے کیا پڑھتی ہیں لیکن وہ پڑھتی بہرحال ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ اس طرح وہ ہندی، ہندوستانی اور اردو تینوں زبانیں بول سکیں گی مجھے ڈر ہے ان کی زبان محل کی چار دیواری کے باہر کہیں نہ سمجھی جائے گی۔

مالا بار میں کمیونزم کا بہت پرچار کیا جا رہا ہے اور وہاں کے کمیونسٹ قومی خدمت کے کام بڑے خلوص سے انجام دیتے ہیں وہاں ہندو اور مسلمان کا کوئی اختلاف نہیں، جو اختلاف ہے وہ کمیونسٹ اور کانگرسی کا ہے۔ کمیونزم کی تحریک نوجوانوں اور خاص طور سے طالب علموں میں پھیلی ہے، اور انھوں نے کملا دیوی کا استقبال بہت جوش کے ساتھ اس وجہ سے کیا کہ وہ کملا دیوی کو کمیونسٹ سمجھتے تھے۔ انھیں بڑی مایوسی ہوئی جب کملا دیوی نے یہ صاف صاف کہدیا کہ اب ان کا کمیونسٹ پارٹی سے کوئی تعلق نہیں مالا بار میں کمیونسٹوں نے جگہ جگہ اپنے مرکز بنائے ہیں، مردوں کے الگ عورتوں کے الگ۔ ان میں شوق، حوصلہ اور صلاحیت کی کوئی کمی نظر نہیں آتی ۔۔۔ خدمت کے جو موقعے قحط اور وباؤں نے پیدا کئے ہیں ان سے وہ پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

کتب موصولہ پر ایک نظر

ہمارے ہندوستانی مسلمان

تالیف ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر۔ مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین صاحب، ناشر اقبال اکیڈمی، ظفر منزل تاج پورہ لاہور۔

یہ ولیم ہنٹر کی وہ کتاب ہے جس نے انیسویں صدی کے آخری ربع میں ہمارے انگریز حکمرانوں کے خیالات کے تعمیر کرنے میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ اس میں حضرت سید احمد بریلویؒ کی تحریک مجاہدین پر جو ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کی ایک زبردست کوشش تھی مفصل تبصرہ حامیانِ تحریک کی حیرت انگیز تنظیم اور ان کی ایمان افروز قربانیوں کی داستان، دارالاسلام اور دارالحرب کی بحث اور جہاد کی حقیقت اور انگریزی حکومت کے ہاتھوں مسلمانوں سے جو ناانصافیاں ہوئی ہیں ان کا درد انگیز بیان ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ انگریزوں کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ ایسا تھا کہ جس سے بجا طور پر مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور بغاوت کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے تھا اور انگریزوں کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم اور اصلاح و ترقی کے لئے خاص طور پر کوشش کریں۔ اس کتاب کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس میں اعداد و شمار کے ذریعے یہ دکھلایا گیا تھا کہ مسلمان کس طرح حکومت کے اعلیٰ عہدوں اور علمی پیشوں سے ارادتاً بتدریج خارج کئے گئے اور... کس طرح وہ گمنامی اور محرومی کی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ مسلمانوں کی معاشی حالت پر تبصرہ کرتے وقت اکثر اس کتاب کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صادق حسین صاحب کا یہ کارنامہ قابلِ ستائش ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو اُردو کا جامہ پہنایا۔ ترجمہ کی زبان شستہ صاف اور بامحاورہ ہے۔ کتابت، طباعت، جلد، گردپوش سب اعلیٰ معیار کے ہیں۔ ۳۰۲ صفحات کی کتاب ہے اور اس کی قیمت دو روپیہ بارہ آنہ (۲/۱۲) رکھی گئی ہے۔

سوویٹ روس

از محمد کلیم اللہ صاحب، ناشر ماڈرن بک ڈپو، سلطان بازار، حیدرآباد دکن۔ کتابت

طباعت، جلد، گردپوش اعلی معیار کے ۳۲۰ صفحات۔ قیمت تین روپے۔

مولف نے کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ معاشی زندگی سے متعلق ہے دوسرا سیاسی زندگی سے اور تیسرا معاشرتی زندگی سے۔ پہلے حصے میں صنعتی نظام، زرعی نظام، طبعی سائنس اور تقسیم پیداوار کے نظام کا حال، انقلاب سے قبل، انقلاب کے بعد، نئی معاشی پالیسی، پہلے دوسرے اور تیسرے پنج سالہ منصوبوں اور جنگ کے زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھ کر بیان کیا گیا ہے اور آخر میں روس کے معاشی تحفظ کے انتظامات سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

دوسرے حصے میں سویٹ حکومت کے نظام، اس کے اجزا اور سویٹ دستور کی خصوصیات خارجی حکمت عملی قومیت کا مسئلہ اور سرخ فوج سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

تیسرے حصے میں تعلیم و تربیت، فنون لطیفہ، صحت جسمانی اور کھیل، عورتوں کی حیثیت اور مذہب و اخلاق سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

اردو میں یہ غالباً پہلی کتاب ہے جس میں سویٹ روس کے بارے میں اس قدر شرح و بسط کے ساتھ معلومات فراہم کی گئی ہیں اور چھوٹے پیمانے پر اسے سڈنی اور بیٹرس ویب کی کتاب "سویٹ روس، ایک نئی تہذیب" کا بدل سمجھا جاسکتا ہے۔ مصنف کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں ایسے مصنفوں کی تحریروں سے مدد لی گئی ہے جن کی غیر جانبداری اور ایمانداری پر کسی کو بھی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔

کتاب کی زبان سلیس اور آسان ہے۔ محمد کلیم اللہ صاحب اس عمدہ تالیف کے لئے مستحق مبارکباد ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی | از پروفیسر محمد سرور صاحب۔ ناشر سندھ ساگر اکادمی لاہور۔ کتابت طباعت، جلد، گردپوش کا معیار اعلیٰ ۴۰۸ صفحات۔ قیمت للعہ

اس مشہور شخصیت کے نام سے سب واقف تھے لیکن اس کے خیالات کو مرتب اور منظم صورت میں وہ لوگ بھی نہیں سمجھ سکے جنھیں مولانا سے خاصا قریب رہنے کا موقع ملا تھا۔ یہ مولانا کے عزیز اور

ہونہار شاگرد پروفیسر محمد سرور صاحب کا بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے مولانائے مرحوم کے حالات زندگی تعلیمات اور سیاسی افکار کو عام فہم سلیس اور دلچسپ انداز میں مرتب کر دیا وہ اس کام کے لئے ہر طرح اہل اور مجاز تھے اور انھوں نے اپنے فرض کو نہایت حسن اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ یہ کتاب مولانائے مرحوم کی زندگی میں شائع ہوگئی تھی۔ اس کی مخالفت میں ان کے کسی بیان کے شائع ہونے کا ہمیں ابھی تک علم نہیں ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اس کے تمام بیانات سے متفق الرائے تھے

مولانا کی شخصیت بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے اور آئندہ شاید اور زیادہ بنے گی لیکن ہمیں اُمید ہے کہ سرور صاحب کی یہ کتاب مولانا کے معتقدوں اور مخالفوں دونوں کے لئے ایک مستند ماخذ کا کام دے گی۔ کتاب کی ترتیب اور طرز بیان دونوں نہایت خوب ہیں۔ شاگرد نے استاد کے افکار و خیالات کو اس قدر اپنا کر پیش کیا ہے کہ بعض وقت شبہہ ہونے لگتا ہے کہ یہ خیالات واقعی مولانائے مرحوم کے ہیں یا ان کے ہونہار شاگرد کے اپنے ذاتی خیالات ہیں جو انھوں نے مولانا سے منسوب کر دئے ہیں۔ اسے مرتب کی بڑی خوبی سمجھنا چاہیے۔ ر۔

مشرق بعید

از شاہد حسین صاحب رزاقی، ناشر دار الاشاعت سیاسیہ، حیدرآباد دکن صفحات ۱۴۲ قیمت عہ۔ غیر مجلد کتابت طباعت اچھی۔

اس کتاب کے حصہ اول میں مشرق بعید کے جملہ علاقوں مثلاً سائبیریا، منگولستان، مانچوکو کوریا، جاپان، چین، سندی چین، تھائستان، جزائر شرق الہند، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ کے بارے میں مستند معلومات فراہم کی گئی ہیں جن کی وضاحت اس علاقے کا ایک نقشہ دے کر کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں سامراجی دول کی سیاسی بساط یعنی چین کے جو مختلف دول سے تعلقات رہے ہیں ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ ابتدائیہ میں ایک عام تبصرہ موجودہ بین الاقوامی سیاست پر ہے۔ کتاب نہایت قابلیت کے ساتھ مرتب کی گئی ہے اور اس کی زبان نہایت صاف اور سلیس ہے۔

پارلیمانی طرز حکومت

از منظور الحسن صاحب ہاشمی۔ ناشر دار الاشاعت سیاسیہ، حیدرآباد دکن صفحات ۹۶۔ قیمت ۱۲ر غیر مجلد۔ کتابت، طباعت اچھی۔

یہ کتاب انگلستان، فرانس، سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا کی پارلیمنٹ کے حالات پر مشتمل ہے شروع میں ایک نقشہ جدید مملکتوں کی تقسیم اور دوسرا پارلیمانی حکومتوں کے اجمالی خاکہ کا دیا گیا ہے۔ انگریزی نظامِ حکومت کے لیے کتاب کے کل نو ابواب میں سے چھ ابواب وقف کیے گئے ہیں اور ضمیمہ میں سیاسی اصطلاحات کی تشریح اور اہم آئین آزادی کو درج کیا گیا ہے۔ کتاب طلبہ اور عام واقفیت حاصل کرنے والے افراد کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

۱۔ اقبال کا تصورِ زمان و مکان
۲۔ موت و حیات اقبال کے کلام میں

مرتبہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب
ناشر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاجپورہ، لاہور

ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدر شعبہ ریاضی حیدرآباد دکن صرف ریاضی داں نہیں ہیں بلکہ ایک اسلامی فلاسفر اور ادیب بھی ہیں آپ نے "اقبال ڈے" کے موقع پر یہ دو مقالے پڑھے تھے جنھیں ناشرین نے مختصر غیر مجلد رسالوں کی صورت میں شائع کر دیا ہے، پہلے مقالے کے موضوع پر ڈاکٹر رضی الدین صاحب ہی کو قلم اُٹھانے کا حق تھا اور انھوں نے قابلیت کے ساتھ اس فرض کو پورا کیا ہے۔ دوسرا مقالہ بھی اپنی جگہ پر خوب ہے۔

اقبال کے چند جواہر ریزے

مرتبہ خواجہ عبدالحمید صاحب ایم اے
ناشر: اقبال اکیڈمی، لاہور

یہ مقالہ رسالہ معارف میں شائع کیا جا چکا تھا، اسے اب رسالے کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ اس میں ان قیمتی اقوال کو جمع کر دیا گیا ہے جو مختلف صحبتوں میں مرتب نے اُن کی زبان سے خود سُنے تھے۔ ان کا حسن اور ان کی دلچسپی کسی تعارف و تعریف کی محتاج نہیں ہے۔

علمائے کرام کا مستقبل

مرتبہ منظر الدین صاحب صدیقی
ناشر اقبال اکیڈمی، لاہور

اس رسالے میں علماء کی موجودہ سیاست اور رہنمائی سے اختلاف کرتے ہوئے انھیں متنبہ کیا گیا ہے کہ اگر وہ اس پر قائم رہے تو ہندوستان میں بھی ترکی اور ایران کی تاریخ دہرائی جائے

کی کتاب سطحی ہے اور تشدد پسندی پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ موضوع کی نزاکت کا تقاضا تھا کہ زیادہ تفکر و تدبر سے کام لیا جاتا۔

ذہنی زلزلے از مقیم صاحب صدیقی، ناشر دار الاشاعت نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن۔ کتابت طباعت، جلد، گرد پوش اعلیٰ، ۱۹۲ صفحات، قیمت ؎

یہ چند تفریحی تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں نہایت کامیاب طریقے پر "جدت پسندی" کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ اچھوتے موضوع، نئے طرز ادا، مشاہدہ اور تصویر کشی کی صحت اور ٹیکنیک کی جدت کے لحاظ سے اس کتاب کی تحریروں کا شمار ادب لطیف کے معیاری نمونوں میں کیا جا سکتا ہے۔ مصنف جدید ادب اردو کے داخلی پہلو سے مطمئن نہیں ہے۔ اس کے الحاد، فحش نگاری، خواہشات کی بے قیدی کو برا سمجھتا ہے اور اس کی جگہ اخلاقیات کو ادب میں دوبارہ داخل کرنا چاہتا ہے۔ مصنف کا قیام دار السلام پٹھان کوٹ میں ہے اور وہ "کوثر" (سابق سلمان) کے مدیر معاون ہیں۔

بیل بوٹے از مظفر حسین صاحب شمیم ناشر سلطان حسین تاجر کتب بھنڈی بازار بمبئی نمبر ۳، کتابت طباعت جلد، گرد پوش اچھا، صفحات ۱۴۴ قیمت ؎

یہ مصنف کے ان مضامین اور افسانوں کا مجموعہ ہے جو ایک صحافی کی حیثیت سے انھوں نے مختلف رسالوں اور اخباروں میں شائع کئے ہیں اور خاصا قابل تعریف ہے۔

گاؤں سدھار گیت از مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر۔ ناشر آزاد بک ڈپو کوچہ چیلان دہلی۔ غیر مجلد صفحات ۸۰ قیمت ۸/

یہ گیت دیہات کے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کے لئے لکھے گئے ہیں اور ان کے اچھے ہونے کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ "بچوں کے تحفے" کے مصنف کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کا تعارف بھی موجود ہے۔

سرخ سویرا از مخدوم محی الدین صاحب ناشر اشاعت گھر حیدرآباد دکن صفحات ۱۲۴۔ قیمت ؏ کتابت، طباعت، جلد، گرد پوش اعلیٰ۔

یہ مخدوم محی الدین صاحب کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ صاحب موصوف ایک سرگرم عمل کمیونسٹ ہیں۔ ان کی نظموں میں اُن کے عقیدوں اور زندگی کا رنگ جھلکتا ہے۔

اُردو کا سب سے بڑا شاعر مصحفی — از قاضی عبدالصمد صاحب صارم۔ ناشر مصنف خود غیر مجلد صفحات ۱۴۴۔ کتابت، طباعت اچھی۔ قیمت عہ

اس میں مصحفی کے حالاتِ زندگی اور اس کے کلام پر عالمانہ تبصرہ ہے

راحت کدہ — از خواجہ عبدالسمیع پال اثرِ صہبائی۔ ناشر تاج کمپنی لاہور۔ کتابت، طباعت جلد نہایت دیدہ زیب۔

یہ جناب اثرِ صہبائی کے کلام کا مجموعہ ہے اور اس پر خان بہادر مرزا جعفر علی خاں صاحب اثرؔ لکھنوی نے مقدمہ لکھا ہے۔

دیہات میں تعلیم — از عبدالشکور صاحب ناشر نظامی پریس، بدایوں۔ غیر مجلد قیمت عہ

اس میں گاؤں کی تعلیم کیا ہونا چاہیے اس سے بحث کی گئی ہے۔

مشاہیر کی بیویاں — از طاہرہ رفعت ناشر دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد غیر مجلد قیمت ۱۲ر

یہ کتاب اس عنوان کا حصہ اوّل ہے اور اس میں مغرب کے مشاہیر کی بیویوں کے حالات لکھے ہیں جس میں میڈم اسٹالن، سنورا مسولینی، مسز چرچل، مسز روز ولٹ، پولو فرانکو اور مسز ڈی ویلرا کو شامل کیا گیا ہے۔ کتاب دلچسپ ہے۔

تذکرہ دارالعلوم — از نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ غیر مجلد عہ ملنے کا پتہ حبیب کمپنی، حیدرآباد دکن۔

اس کتاب میں دارالعلوم، حیدرآباد دکن کی تاریخ درج کی گئی ہے۔

افسانے اور ڈرامے

قیدخانہ | از احمد علی صاحب۔ ناشر انشا، پریس، دہلی۔

یہ احمد علی صاحب کے چار نئے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ موصوف انھیں اپنے سب افسانوں میں زیادہ اہم سمجھتے ہیں نہ صرف افسانوی پہلو سے بلکہ فلسفی نقطۂ نظر سے بھی" احمد علی صاحب نہ صرف سخن گو ہیں بلکہ سخن شناس بھی ہیں۔ اس لئے اگر وہ یہ کہتے ہیں تو دوسروں کو بھی ان کی اس بات کو تسلیم کرنا چاہیئے اگرچہ ان افسانوں کا موضوع فہم عام سے کچھ بالا معلوم ہوتا ہے۔ طباعت کتابت گردپوش عمدہ۔

کارخانہ | از محمد فضل الرحمن صاحب، ناشر عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن

یہ ایک مختصر مزاحیہ ڈراما ہے۔ غیر مجلد۔ قیمت ۱۲ر

نراس | از نور الحسن صاحب۔ ناشر دی حیدرآباد بک ڈپو

یہ چھ افسانوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے، طباعت، کتابت، جلد، گردپوش اعلیٰ قسم کے۔ عہ ۱۲ر

کنول | از اعظم کریوی صاحب، ناشر عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن

تیرہ افسانوں کا مجموعہ ہے طباعت، کتابت، جلد، گردپوش اعلیٰ قسم کے۔ قیمت عگر ۱۲ر

خانقاہ | از ایم، اسلم صاحب۔ ناشر عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد دکن

نو افسانوں کا مجموعہ ہے۔ طباعت، کتابت " عگر ۱۲ر

سادہ و رنگین افسانے | از ظفر قریشی۔ ناشر عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن۔

بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ طباعت، کتابت، جلد، گردپوش اعلیٰ قسم کے " عگر ۸ر

دل کے آنسو | از رئیس احمد صاحب جعفری۔ ناشر مکتبہ سلطانی بھنڈی بازار بمبئی۔

چھ اچھے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ طباعت، کتابت، جلد، گردپوش اعلیٰ قسم کے " عہ ۱۲ر

حالاتِ حاضرہ

(الف) ہندوستان

مابعد جنگ کے لئے حکومت کے تعمیری منصوبے

حکومتِ ہند چاہتی ہے کہ لوگ ماضی کو بھول جائیں ، حال سے غافل رہیں اور اپنی نظریں مستقبل کی طرف جمائے رکھیں۔ اس کا جو محکمہ اس وقت پروپیگنڈے کے ذریعے سب سے زیادہ عوام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے وہ تعمیر نو کا محکمہ ہے۔ منصوبہ بندی کے نئے وزیر سارے ملک کا دورہ کرتے پھر رہے ہیں اور اپنی تقریروں میں مابعد جنگ کی معاشی ترقی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے ہیں اور متعلقہ افراد اور اداروں سے مشاورت کرتے رہے ہیں۔ وائسرائے کی کلکتہ کی تقریر میں بھی جس کا نہایت بے چینی سے لوگوں کو انتظار رہتا ہے۔ موجودہ سیاسی جمود کو دور کرنے کا کوئی اشارہ نہیں تھا۔ نہ ہندوستان کو جنگ کی موجودہ مشکلوں سے جلد نجات دلانے کی کوئی اُمید دلائی گئی تھی بلکہ اس کی جگہ انھیں اس بات کا یقین دلایا گیا تھا کہ ان کی قربانیاں دوسرے ملکوں کے مقابلے میں جو جنگ کا واقعی محاذ بنے ہوئے ہیں۔ بہت کم رہی ہیں اور اس بنا پر انھیں دعوت دی گئی تھی کہ وہ ۱۹۴۵ء میں اور زیادہ قربانیوں کے لئے تیار رہیں۔ اُن کی تقریر میں اگر کوئی اُمید افزا حصہ تھا تو وہ مابعد جنگ کی تعمیر نو سے متعلق تھا۔ انڈین اکنامکس کانفرنس کا جو اجلاس دسمبر کی آخری تاریخوں میں دہلی میں منعقد ہوا اس کا افتتاح منصوبہ بندی کے وزیر سرارد شیر دلال نے کیا اور قدرتی طور پر ان کی تقریر کا موضوع مابعد جنگ کے تعمیری منصوبے ہی تھے۔ کانفرنس کے صدر ڈاکٹر ایل کے حیدر کے خطبہ کا بھی زیادہ تر یہی موضوع تھا۔ کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں جو مقالے پڑھے گئے اور تقریریں ہوئیں وہ بھی زیادہ تر اسی موضوع کے کسی نہ کسی پہلو سے متعلق تھیں۔ غرض آج کل ہندوستان کے

بحث کے طبقہ کا موضوع بحث و گفتگو بھی تنظیم مابعد جنگ ہے۔

اس وقت تک بہت سے منصوبے تیار ہو چکے ہیں اور بہت سے تیار ہو رہے ہیں لیکن یہ سب ایسے لوگوں کی طرف سے تیار کئے گئے ہیں جو سیاسی اقتدار کے مالک نہیں ہیں اس لئے اُن کے نفاذ کی کوئی ذمے داری ان پر عاید نہیں ہوتی اور ان منصوبوں کی حیثیت موجودہ حالات میں مشوروں یا سیاسی پروپیگنڈے سے زیادہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ لیکن نومبر ۱۹۴۴ء میں وائسرائے کی عاملہ کی تعمیرِ کمیٹی نے ترقیات مابعد جنگ کے بارے میں اپنی جو رپورٹ شائع کی ہے وہ ایک برسرِ اقتدار اور ذمے دار حکومت کا منصوبہ ہے اس لئے ہماری توجہ کا سب سے زیادہ مستحق ہے حکومت ہند کے مختلف محکموں نے اب تک جس قدر منصوبہ بندی کی ہے یہ رپورٹ اسی کا ایک خلاصہ ہے۔ یہ اس سلسلے کی دوسری رپورٹ ہے۔ پہلی رپورٹ یکم فروری ۱۹۴۴ء کو شائع ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی حیثیت بھی سیاسی پروپیگنڈے سے زیادہ نہ ہو لیکن یہ ایک صاحب اقتدار حکومت کی طرف سے ہے جس کی بات کو پکڑا جا سکتا ہے اس لئے اس رپورٹ کو ایک مستند اور اہم دستاویز سمجھنا چاہئے۔ اس سے حکومتِ ہند کی ذہنی پرواز اور اس کے آیندہ کے منصوبوں اور پالیسیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ حکومتِ ہند مابعد جنگ کی تعمیری کوششوں کو کس حد تک قابلِ عمل سمجھتی ہے۔

اس رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے :-

تنظیم مابعد جنگ کے بڑے مقاصد کو دو عنوانوں کے ماتحت تقسیم کیا جا سکتا ہے :-

(الف) وہ جن کو چھوٹی مدت میں حاصل کیا جائے گا اور (ب) وہ جن کو لانبی مدت میں حاصل کیا جائے گا۔ اول کو صحیح معنی میں اصلاح و مرمت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے اس کام کو بھی طویل مدت کی ترقی کی اسکیموں کے ساتھ ساتھ چلانے کی ضرورت ہوگی۔ ان میں حسب ذیل چیزیں شامل ہیں :-

(۱) مدافعتی کام یا جنگی صنعت وغیرہ میں لگے ہوئے لوگوں کو دوبارہ اس کے کام میں لگانا اور

بسانا۔

(۲) زائد فوجی ذخیروں، سامانوں، زمین اور عمارتوں کو دوسرے لوگوں کو فروخت یا حوالے کرنا۔

(۳) صنعت کو جنگ کے کام سے امن کے کام میں منتقل کرنا۔

(۴) نگرانیوں کا امن کے حالات کے تقاضوں کے مطابق ختم کرنا یا ان کے اندر ضروری ترمیم کرنا

(ب) لانبی مدت کی تجاویز کو زیادہ مناسب طریقے پر ترقی و توسیع کے عنوان کے ماتحت رکھا جا سکتا ہے اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں لیکن کچھ مدیں ایسی ہیں جن پر بہت سا سرمایہ لگانا ہوگا اور یہ ترقی کے لیے بصورت مجموعی بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے :۔

(۱) بجلی کی قوت کی ترقی جس پر صنعتی ترقی اور اس سے کم درجے پر زراعتی ترقی، پمپ کے ذریعے آبپاشی اور دیہاتی صنعت کا دارومدار ہوگا

(۲) صنعت کی ترقی جس میں دولت آفریں اشیاء اور ایسی صرف کی اشیاء کی پیدائش جو عام استعمال میں آتی ہیں خاص طور پر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں چھوٹی اور خانگی صنعتوں کا تحفظ اور ان کی ترقی بھی شامل ہے۔

(۳) سڑکوں کی آمدورفت اور نقل وحمل کی خدمات کی ہمہ گیر طریقہ پر ترقی خصوصاً دیہی علاقوں میں۔

(۴) زراعت کی ترقی اور اس کے ساتھ آبپاشی، زمین کے کٹاؤ کی انسدادی تدبیروں اور نئی زمینوں کی کاشت وغیرہ کی ترقی ان کاموں میں حکومت اور نجی کمپنیوں کو بہت ... خرچ کرنا ہوگا اور اس سے جو زیادہ آمدنی حاصل ہوگی اسی سے بعد میں اجتماعی خدمات کو جدید طریقے پر تنظیم دی جا سکے گی۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تعلیم، تندرستی اور مکانات کی ترقی کی کوشش

اُن کے ساتھ ساتھ شروع نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ایسا کرنا نہ صرف جماعتی بہبود کے لئے بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ تعلیم خصوصاً فنی تعلیم کی قابلِ لحاظ ترقی زراعت، صنعت وغیرہ کی ترقی کا ایک لازمی پیش خیمہ ہے۔ غرض اس قسم کے کاموں کو حکومتِ ہند نے اپنے منصوبے کے مقاصد میں داخل کیا ہے اور ان کے بارے میں تفصیلات مہیا کی ہیں۔

ابتدائی پانچ سال کے منصوبوں کو چلانے کے لئے جس قدر روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت ہوگی مالیاتی منصوبہ بنانے والوں کا خیال ہے وہ کافی مقدار میں فراہم ہو سکے گا۔ اندازہ یہ ہے کہ ترقی کے کاموں کے لئے ابتدائی پانچ سالوں کے واسطے یعنی ۱۹۴۷-۴۸ء سے ۱۹۵۱-۵۲ء تک دس ارب روپئے کی رقم فراہم ہو سکے گی۔ اس میں سے پانچ ارب تو میزانیہ کی توفیروں پر مشتمل ہوگی اور اس سے یا تو ترقی کی ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کا کام لیا جائے گا جن کا خرچ قرض دے کر پورا نہیں کیا جائے گا یا اس کے ذریعے مسلسل یا غیر مسلسل امدادیں عطا کی جائیں گی۔ بقیہ پانچ ارب کی رقم ان مرکزی اور صوبجاتی قرضوں پر مشتمل ہوگی جنھیں مرکزی حکومت دے گی۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ دس ارب کی اس رقم میں قرض کی وہ رقم شامل نہیں ہے جو نجی شغل اصل کے لئے بازار میں موجود ہوگی اور جس کی مقدار کو تقریباً پانچ ارب کے برابر سمجھنا چاہیے اس طرح کل سرکاری اور غیر سرکاری رقم کی میزان جو ترقی کے کاموں میں لگائی جا سکے گی پندرہ ارب کے قریب ہوگی۔ تقریباً اتنی ہی رقم کے خرچ کا اندازہ ٹاٹا برلا کے منصوبہ بنانے والوں نے بھی اپنے منصوبے کے ابتدائی پانچ سالوں کے لئے کیا تھا۔ اس لئے جہاں تک ابتدائی پانچ سالوں میں روپئے کی مجموعی رقم کے خرچ کرنے کا تعلق ہے ٹاٹا برلا کے منصوبے اور اس سرکاری منصوبے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اس منصوبے کے ایک اور پہلو پر بھی اجمالی نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔ اس منصوبے میں کس صنعت کی ترقی کو ترجیحی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا صحیح تعین تو عمل میں لایا جائے گا لیکن عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قوتِ محرکہ کی صنعت کی ترقی کو جو تمام صنعتی ترقی کی بنیاد ہے اور دوسری صنعتوں پر مقدم رکھا جائے گا۔ اسی طرح شروع میں ایسی دولت آفریں اشیا کی

صنعتوں کی ترقی کو بعض قومی مقاصد کے لئے لازمی سمجھا جائے گا۔ اشیار صرف کی صنعتوں کے مقابلے میں مقدم رکھا جائے گا۔ ان میں لائق ذکر حسب ذیل ہیں۔ لوہے اور فولاد کی صنعت مشین سازی کی صنعت مشین کے اوزاروں کی صنعت وزنی کیمیاوی صنعتیں اور کھاد کی صنعتیں۔ لیکن توجہ اگر صرف دولت آفریں اشیاء تک محدود رکھی گئی تو اس کی وجہ سے جو زائد قوت خرید پیدا ہوگی اس کو چیزوں کے استعمال کرنے پر صرف نہیں کیا جاسکے گا۔ اس کی وجہ سے افراطِ زر پیدا ہوگا اور خریداروں کو دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس لئے ساتھ ہی ساتھ فوری طور پر استعمال میں آنے والی چیزوں کی صنعت کو بھی ترقی دینا ضروری ہوگا۔ اس قسم کی بہت سی صنعتیں ہیں جن کو جنگ کے زمانے میں نشوونما ملی ہے اور یہ امن کے زمانے کی ضرورتوں کو بھی پورا کرسکتی ہیں۔ ان کی خبر گیری کرنا ہوگی۔ اسی زمرہ میں چھوٹی اور خانگی صنعتوں کو بھی رکھا جاسکتا ہے اور ان کی بھی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ انھیں چلانے کے لئے نسبتاً کم سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ لیکن ان کے ذریعے زیادہ کام کرنے والوں کو روزگار سے لگایا جاسکتا ہے۔ غرض جب منصوبہ ترقی پائے گا تو ترجیح کے مسئلے کو ان اصولوں کی روشنی میں اور ملک کے مختلف حصتوں کی ضرورتوں کو ساتھ رکھ کر طے کرنا ہوگا

حکومت کی نگرانی اور ملکیت کے سوال کا رپورٹ میں یہ جواب دیا گیا ہے کہ جدید خیالات کا رجحان یہ ہے کہ صنعتوں پر مملکت کی نگرانی بڑھائی جائے تاکہ نفع طلبی کی ذہنیت کو معاشرتی ضرورتوں کا پابند بنایا جاسکے۔ مملکت کا تعلق صنعت سے تین طرح کا ہوسکتا ہے (۱) مالک یا شریک کار کا (۲) نگرانی کرنے والے کا (۳) انتظام کرنے والے کا۔ بعض صنعتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا قومی مفاد کے پیش نظر مملکت کو مالک اور منتظم دونوں بننا پڑتا ہے۔ دوسری ایسی صنعتیں ہوتی ہیں جن کا قومی مفاد کے لئے قائم کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن جن کے لئے نجی افراد سرمایہ لگانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ان کی صرف ملکیت، حکومت اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے اور انتظام نجی کمپنی کو سپرد کردیتی ہے۔ لیکن صنعت کے ساتھ حکومت کا تعلق عام طور پر صرف نگرانی کرنے والے

کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اس نگرانی کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ حکومت اپنی طرف سے ڈائرکٹر نامزد کر سکتی ہے لائسنس لینا ضروری قرار دے سکتی ہے۔ منافع کو محدود کر سکتی ہے اور یہ نگرانی بڑھ کر پیدائش یا تقسیم دولت یا دونوں کی مکمل نگرانی تک پہنچ سکتی ہے۔ جن صنعتوں کے لئے حکومت کی کچھ نگرانی ضروری ہوتی ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

عام فائدے کی صنعتیں، بنیادی صنعتیں اور ایسی صنعتیں جو ان کچے مالوں کو استعمال کرتی ہیں جن کی رسد قلیل ہے کیونکہ یہ صنعتیں ایسی ہیں کہ اگر ان پر نگرانی قائم نہ کی جائے تو یہ اجاروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس منزل پر اس بات کا تعین کرنا ضروری ہے کہ حکومت کن صنعتوں پر نگرانی قائم رکھے گی۔ عام طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سوائے ان صورتوں کے جہاں قومی مفاد میں نگرانی قائم کرنا ضروری ہوگا باقی تمام صورتوں میں صنعت کو مقابلہ کرنے والے نجی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں رہنے دیا جائے گا۔ لیکن ان کی اتنی نگرانی ہمیشہ کی جائے گی جس سے مزدوروں کے استحصال ناجائز کا تدارک کیا جا سکے اور ان کے لئے معقول اجرت اور مہذب حالات زندگی کو یقینی بنایا جا سکے۔

دولت کی زیادہ بہتر تقسیم کے سوال کا رپورٹ میں یہ جواب دیا گیا ہے کہ ایک طرف تو غریبوں کے طبقے کو مختلف سہولتیں مفت یا کم قیمت پر فراہم کی جائیں گی۔ مثلاً چودہ سال کی عمر تک تعلیم، طبی امداد، پانی کی فراہمی اور دوسری افادہ کی چیزیں جن میں بجلی کی طاقت بھی شامل ہے۔ مفت یا کم قیمت پر فراہم کی جائیں گی۔ ان کے علاوہ اور کارکردگی میں جو عام بہتری پیدا ہوگی اس کا بھی اثر اُن کی معاشی بہتری پر پڑے گا۔ دوسری طرف اُن کے لئے منصفانہ شرائط حاصل کرنے (یعنی معقول اجرت، زچگی اور بیماری کے زمانے میں امداد، رخصت با تنخواہ وغیرہ) کے لئے خاص قوانین بنائے جائیں گے۔ صنعتوں کو جس طریقے پر توسیع دی جائے گی اس کا بھی یہ اثر ہوگا کہ پیدائش دولت کے ذرائع کی ملکیت لوگوں کی زیادہ کثیر تعداد کے ہاتھ میں پہنچ جائے گی۔ بڑی صنعتوں کے معاملے میں بھی، چونکہ ان کے منافع کے بڑے حصے کے کاروبار کو زیادہ وسیع کرنے کے لئے دوبارہ صنعت میں لگانا ہوگا، اور اس کام کے لئے ان کی نگرانی کرنا اور ایک حد تک ان پر محاصل لگانا ضروری ہوں گے۔ اس لئے اس کا بھی یہ اثر ہوگا کہ دولت چند ہاتھوں کے اندر مجتمع نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ موجودہ

زمانے میں جو بدترین افلاس اور زبردست دولت مندی کا نہایت نمایاں فرق نظر آتا ہے وہ باقی نہیں رہے گا۔

اس کے علاوہ حکومت پس ماندہ طبقوں اور فہرست میں درج کی ہوئی ذاتوں کی حالت کو بہتر کرنے کی بھی خاص طور پر کوشش کرے گی۔ عام اجتماعی سہولتوں سے انھیں خاص طور پر مستفید ہونے کا موقع دیا جائے گا اور جہالت اور غربت کی وجہ سے انھیں جس ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُسے تعلیمی سہولتیں، زمین کے عطیات، وظیفے، دارالاقامے، بہتر پانی کا انتظام وغیرہ فراہم کرکے دور کیا جائے گا۔

آخر میں منصوبے کی مدت اور اس کی ترقی کی رفتار کے بارے میں رپورٹ میں بیان کیا گیا کہ منصوبہ بندی کی موجودہ ابتدائی منزل میں لائحۂ عمل کو زیادہ ٹھوس اور معیّن شکل میں پیش کرنا تو ممکن نہیں ہے لیکن ارادہ یہ ہے کہ ایک کل ہند منصوبہ مجمل طور پر زیادہ طویل مدت کے لیے پیش کیا جائے اور دوسرا زیادہ مفصل منصوبہ پانچ سال کے لئے تیار کیا جائے۔ طویل مدّت کے منصوبے عام طور پر پندرہ سال کے لئے ہوں لیکن بعض کاموں کی مخصوص ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے یہ زیادہ طویل مدت کے لئے بھی تیار کئے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر تعلیم کے لئے مرکزی مشاورتی بورڈ کا منصوبہ چالیس سال کے لئے بنایا گیا ہے۔ سڑکوں اور سڑکوں کی نقل وحمل کی ترقی کا منصوبہ دس سال کے لئے ہے۔ زراعت کے لئے جو منصوبہ فی الحال بنایا گیا ہے وہ پندرہ سال کی مدت میں دس ارب روپیہ خرچ کرکے زراعت کی آمدنی کو دوگنا کرنا چاہتا ہے۔ صنعتوں کے لئے ابھی تک کوئی ابتدائی منصوبہ بھی نہیں بنایا جا سکا ہے۔ کیونکہ صنعتی رہنماؤں سے جو معلومات طلب کی گئی تھیں وہ ابھی تک وصول نہیں ہوئی ہیں۔ لیکن صنعتوں کی زیادہ سے زیادہ ترقی کا جو امکان نظر آتا ہے اس کے لئے ابتدائی پانچ سالوں میں جس قدر روپیہ صرف کرنے کی ضرورت ہوگی، امید ہے کہ اس کا انتظام کیا جا سکے گا۔ صنعتی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹیں یہ ہیں کہ ماہر اشخاص اور ضروری ساز وسامان فراہم نہ ہو سکیں گے اس کے علاوہ لوگ ضروری نگرانی اور محاصل کو برداشت کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں گے۔

لیکن اگر سب حالات موافق ہوئے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ صنعتی ترقی کی رفتار کیوں زراعتی ترقی سے بہت زیادہ تیز نہ ہوگی۔

غرض حکومتِ ہند کا منصوبہ فی الحال اسی منزل تک پہنچا ہے۔ ابھی اُسے اور بہت سی منزلوں سے گزرنا باقی ہے۔ لیکن منصوبہ بندی کے بہت سے کام ایسے ہیں جن کا موجودہ جنگ کے زمانے میں آغاز ہو چکا ہے اور ان کا جنگ کے بعد صرف رُخ بدلنا ضروری ہوگا۔ اب اگر فوجی تیاری اور لڑائی جیتنے کے مقصد کو سامنے رکھ کر معاشی تنظیم کی جارہی ہے تو آئندہ ہندوستان کے لوگوں کا معیارِ زندگی بصورتِ مجموعی بلند کرنے اور ہر شخص کے لئے روزگار مہیا کرنے کے لئے اسی تنظیم کو جاری رکھنا ہوگا اور صنعت و تجارت، زر اور ساہوکارے، مبادلہ اور خارجی تجارت پر جو بہت سی نگرانیاں اس وقت قائم ہیں انھیں برقرار رکھنا ہوگا۔

حکومت ہند کی یہ تجاویز کسی انقلابی پروگرام کو پیش نہیں کرتیں بلکہ اصلاحی اور تدریجی ترقی کی حامل ہیں۔ لیکن انھیں بھی کسی حد تک عملی جامہ پہنایا جاسکے گا اور اس کو نافذ کرنے کا کام کون اپنے ذمے لے گا۔ موجودہ حکومت ہند جو کسی سیاسی جماعت کی نمائندہ نہیں ہے یا کوئی اور ـــــ یہ مسئلہ ابھی تک مشتبہ ہے اور جب تک یہ بات مشتبہ رہے گی اس وقت تک ان منصوبوں پر زیادہ اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ (۱۷ جنوری ۱۹۴۵ء)

ممالک غیر

۱۹۴۴ء اتحادیوں کے لئے کامیابی کا سال تھا، مگر وسط دسمبر میں جرمنوں کے حملے نے بہت سی تدبیریں اُلٹ دیں اور اُمیدوں کا خون کر دیا۔ حملہ اچانک ہوا بہت سخت تھا، اور ایسے موقع پر کیا گیا جب اتحادی اور خاص طور پر برطانوی سیاست کے لئے جنگ کا کامیابی کے ساتھ جاری رہنا بہت ضروری تھا۔ مسٹر چرچل چاہتے تھے کہ اٹلی میں مارشل بدولیو کی حکومت رہے، وہ نہیں رہ سکی، برطانیہ کے اصرار پر صرف اتنا ہوا کہ کاؤنٹ سفورزا ئی وزارت میں شامل نہیں کئے گئے۔ پھر بلجیم میں فساد ہوا بعض لوگ کہتے ہیں کہ بلجیم کی ترقی پسند پارٹیوں نے خود ہی اپنے ہتھیار حکومت کے حوالے کر دئے، بعض کا خیال ہے کہ بلجیم کے وزیر اعظم موسیو پیرلو کے کچھ بنائے نہ بنتا اگر جنرل ارسکن بلجیم کی محافظ اتحادی فوج کے سپہ سالار اور برطانوی سیاست کے مقامی نمائندے اپنی قوت کا مظاہرہ اور ارادوں کا اعلان نہ کرتے سب سے نازک مسئلہ یونان کا تھا۔ غالباً مسٹر چرچل یونان کے بادشاہ سے وعدہ کر چکے ہیں کہ یونان میں کوئی سیاسی انقلاب نہ ہونے دیں گے۔ لیکن ایسے وعدے نہ کئے گئے ہوتے تب بھی برطانیہ یونان کے اندرونی معاملات میں دخل دینے پر مجبور ہوتا۔ ترکی نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنی سیاست میں اپنے قومی مفاد کا ہی خیال رکھے گا، کسی کے اثر میں نہ رہے گا، روس نے رومانیہ، بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کو بالکل اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ اگر یونان اور اُس کے ساتھ کریٹ کا جزیرہ بھی برطانیہ کے اثر سے نکل جاتا تو مشرقی بحیرۂ روم میں برطانیہ بہت کمزور پڑ جاتا اور مصر فلسطین اور شام کی سیاست اور نہر سویز کی حفاظت برطانیہ کے قدرتی یا خدا داد حقوق میں شامل نہ رہ سکتی۔ یونان میں دخل دینا اس وجہ سے بھی لازمی ہو گیا کہ وہاں کی ترقی پسند ایلوس پارٹی کومیونسٹ ہے اور غالباً اس کے روس سے تعلقات بھی ہیں ایلوس پارٹی اور برطانوی فوج کے درمیان لڑائی شروع ہوئی تھی اور شدت پر تھی جب فون رنڈسٹٹ نے مغربی محاذ پر حملہ کر کے اس اعتبار کو بہت کمزور کر دیا جو اتحادیوں کو اپنی فوجی قوت پر تھا۔

جرمن حملے کی نوعیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت پہلے سے طے کر لیا گیا تھا۔ جرمن دراصل اپنی سرحد کے قریب پہنچ کر ہی لڑنا چاہتے تھے۔ نورمنڈی میں جو جنگ ہوئی اس کا ایک مقصد یہ ضرور ہوگا کہ اتحادیوں کو آگے نہ بڑھنے دیا جائے، لیکن جرمن ہائی کمانڈ کو معلوم ہوگا کہ یہ مقصد پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے یہ ضمنی قرار دیا گیا ہوگا، اور اتحادیوں کو صرف اتنے عرصے تک روکنے کی کوشش کی گئی ہوگی کہ جرمن فوجیں فرانس سے ہٹائی جائیں۔ اتحادیوں کی قوت اور جنگ کے اتفاقات کو دیکھتے ہوئے یہ کارروائی بغیر کسی بڑے نقصان کے عمل میں آئی، مگر یہ تھی بہرحال پس پائی، اور اس نے یہ خیال پیدا کیا، جسے مسلسل محاذ قائم ہونے کے بعد کی اتحادی کامیابیاں تقویت پہنچاتی رہیں کہ جرمنی میں پیش قدمی کرنے کی طاقت نہیں رہی ہے۔ اتحادی ایسا محاذ بنا سکتے تھے کہ جو حملہ اور مدافعت دونوں کے لئے مناسب ہوتا۔ لیکن اس سے اُن کی پیش قدمی کی رفتار بہت سست ہو جاتی۔ انھوں نے جنگ کی تنظیم میں پیش قدمی کی ضروریات کا زیادہ لحاظ رکھا اور شاید اس خطرے کو نظر انداز کیا کہ جرمن اُن کے محاذ کو توڑ بھی سکتے ہیں۔ جرمن ہائی کمانڈ اس حقیقت سے واقف تھا اور اس نے ان تمام موقعوں سے فائدہ اُٹھانے کی تدبیریں کیں جو اچانک اور کامیاب حملہ پیدا کر سکتا ہے۔ طاقتور ہوائی بیڑے۔ نئی توپوں اور ٹینکوں کے علاوہ پیراٹروپوں سے بھی کام لیا گیا، اتحادی محاذ کے پیچھے جرمن جاسوس پہنچائے گئے، امریکی فوجوں کی جو لاریاں، موٹر، توپیں اور دوسرا سامان قبضہ میں آیا وہ فوراً اُن کے خلاف استعمال کیا گیا اور بعض موقعوں پر امریکی سپاہیوں اور فوجی سرداروں کو یہ طے کرنا بہت مشکل ہوا ہوگا کہ وہ اپنے آدمیوں پر گولی چلا رہے ہیں یا دشمنوں پر۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جرمنوں نے لکسمبرگ اور جنوبی بلجیم میں اتحادی محاذ کو توڑ دیا اور پچیس تیس ڈیویژن اس کے پیچھے پہنچا دئے۔ اتحادی انھیں روک نہ پاتے تو یہ شمال کی طرف مڑ کر جنرل منٹگمری اور ہاجز کی فوجوں کی پشت مار سکتے تھے، یا جنوب کی طرف گھوم کر جنرل پیچ اور جنرل پیٹن کی فوجوں کو گھیر سکتے تھے۔ جنوبی بلجیم میں جرمن دریائے میوز کے کنارے پر روک لئے گئے، لیکن انھیں روکنے کے لئے شمال اور جنوب کی اتحادی فوجوں کے خاصے

بڑے حصّے کو اِدھر بھیجنا پڑا اور اس کی وجہ سے یہ دونوں محاذ بھی کمزور پڑ گئے۔ جنوری کے پہلے ہفتے میں جرمنوں نے دریائے زار کی طرف پیش قدمی شروع کی اور جنرل پٹن کی فوجوں کو گھیرے میں پکڑ لیا۔ اُسی کے ساتھ بالکل جنوب میں فرانسیسی کچھ اور پس پا کر دیے گئے۔ آردن کی پہاڑیوں، یعنی بلجیم میں جرمنوں پر دو طرف کی مار پڑ رہی ہے۔ لیکن اُنھوں نے اس علاقے پر قبضہ کرتے ہی ایسی مورچہ بندی کر لی کہ اتحادی فوجوں کو قدم قدم پر لڑنا پڑا اور اُن کی رفتار اتنی سُست ہو گئی کہ محصور جرمنوں کا صفایا کر دینے کا کوئی سوال نہیں رہا۔ اتحادی فوج اپنے ہوائی بیڑے پر بہت بھروسا کرتی ہے اور یہ بیڑا موسم کی ناموافقت کی وجہ سے کوئی خاص مدد نہیں پہنچا سکا۔ چونکہ مختلف اتحادی فوجوں کے درمیان ایسا یقینی تعلق نہیں رہا تھا کہ ایک مرکز سے احکامات جاری کیے جا سکیں اس لئے وہ تین حصّوں میں تقسیم کر دی گئی ہے جو بڑی حد تک اپنے اپنے طور پر لڑیں گے۔ برطانیہ کے اخبار اتحادی سر سپہ سالار جنرل آئزن ہاور پر ایسے اعتراضات کر رہے ہیں کہ ممکن ہے خطرہ دور ہونے کے بعد۔ یا اس کے بڑھ جانے پر۔ ان کی جگہ کوئی اور مقرر کیا جائے۔

اتحادیوں کے لئے یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ یورپ کی سیاست میں پیچ پڑنے اور جنگ میں ناکامی کے ساتھ ہی برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گئے یا اگر وہ پہلے سے موجود تھے تو ان کی شدت بڑھ گئی۔ انگریزوں کو اندیشہ ہے کہ امریکہ دنیا میں اپنا معاشی تسلط قائم کر رہا ہے، امریکن اس کی شکایت کر رہے ہیں کہ برطانیہ، روس اور فرانس بھی یورپ کو سیاسی حلقوں میں تقسیم کر کے بین اقوامی نظام کی تجویزوں کی پہلے ہی سے جڑ کاٹ رہے ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ لڑائی ختم ہوتے ہی وہ متحدہ ریاستوں کو یورپ کی سیاست سے الگ کر دیں گے۔ متحدہ ریاستوں کے وزیر خارجہ سٹے ٹی نیس کئی مرتبہ اپنی حکومت کی طرف سے ایسے موقعوں پر متحدہ ریاستوں کی غیر جانب داری کا اعلان کر چکے ہیں۔ جب برطانیہ کسی ملک کی اندرونی سیاست میں مداخلت کر رہا تھا، اور امریکہ کے ایک ممتاز نامہ نگار ڈریو پیرسن کا بیان ہے کہ یونان کے بارے میں پریزیڈنٹ روزویلٹ اور مسٹر چرچل کے درمیان خاصے سخت الفاظ میں بذریعہ تار گفتگو ہوئی۔ غالباً ڈریو پیرسن

کے ہاتھ میں ایسی تحریریں پہنچ گئیں جو صیغۂ راز میں تھیں اور جن کے اقتباس شائع کرکے اس نے انھیں اور بھی سنسنی خیز بنادیا۔ اختلافات سے بہرحال کوئی انکار نہیں کرتا۔

ادھر پولینڈ میں لبلن کی قومی کمیٹی نے اعلان کیا ہے کہ پولینڈ کی وقتی مگر باضابطہ حکومت وہی ہے اور روس نے اس کی اس حیثیت کو تسلیم کرلیا ہے برطانیہ اور متحدہ ریاستیں پولینڈ کی جلاوطن حکومت سے، جن کا مرکز لندن میں ہے، کئی مسائل میں اتفاق نہیں کرتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جلاوطن حکومت سے قطع تعلق کرلیں گی، صرف اس لیے کہ لبلن کمیٹی کی خواہش ہے کہ وہ ایسا کریں اور روس نے اس خواہش کو برحق مان لیا ہے۔ اتحادی پولینڈ کی جلاوطن حکومت کا ساتھ اس وجہ سے بھی نہیں چھوڑ سکتے کہ متحدہ ریاستوں میں پولستانی امریکن بڑا اثر رکھتے ہیں اور وہ جلاوطن حکومت کے حامی ہیں۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جلاوطن حکومت کی حمایت کیسے کی جائے گی کیا مسٹر چرچل اس کی خاطر پولینڈ میں ایک برطانوی فوج اتاریں گے۔

اتحادیوں کے مقابلے میں روسی سیاست زیادہ یکسوئی اور کامیابی کے ساتھ اپنے منصوبوں پر عمل کرتی رہی ہے لیتھویہ اور لتھوئینیا کے ایک چھوٹے سے حصے کے سوا روسیوں نے ان تمام علاقوں کو فتح کرلیا ہے جن پر وہ براہ راست حکومت کرنا چاہتے ہیں اور رومانیہ، بلغاریہ اور یوگوسلاویہ آزاد ہوکر روس کے حلقۂ اثر میں شامل ہوگئے ہیں۔ لیکن جرمنوں کے خلاف جنگ کرنے میں روسیوں کو ویسی مسلسل کامیابی نہیں ہوئی ہے جیسی کہ خبروں سے ظاہر ہوتی ہے روسیوں نے مشرقی پرشیا، وسطی پولینڈ، لیتھویہ اور معلوم ہوتا ہے اب بوداپسٹ کے شمال مغرب میں بھاری شکستیں کھائی ہیں۔ اس وقت تک جرمن میدان کی وسعت کے سبب سے پس پائی پر مجبور تھے اور وہ اس وجہ سے بھی پورا مقابلہ نہ کرسکے ہوں گے کہ جنگ کی نوعیت بدل رہی تھی اور اس کی مناسبت سے نئی تنظیم کرنے کی ضرورت پیدا ہوگئی تھی۔ اب نئی تنظیم مکمل ہوگئی ہے، شاید جنگ کے لیے نیا سامان بھی تیار ہوگیا ہے اور اب دیکھنا ہے کہ روسی کس محاذ پر اور کس طریقے سے اپنا زور دکھاتے ہیں۔

کوہیما کی داستان



ٹوجو کے آدمی چندوین کو پار کر آئے اور آہستہ آہستہ چھپتے چھپاتے کوہیما اور ناگا کی پہاڑیوں تک پہنچ گئے۔ انہوں نے کوہیما کے ارد گرد چند چوٹیوں پر قبضہ کر لیا۔ ناگا لوگ اپنے گاؤوں سے باہر نکال دیئے گئے۔ ان کے گھر جلا دیئے گئے۔ جھونپڑیاں مسمار کر دی گئیں۔ اُن کے جانور، مرغی خانے اور فصلیں لوٹ لی گئیں۔ یہ جاپانیوں کے بقول "ہندوستان پر چڑھائی" تھی۔

حالات تیزی سے بدلتے گئے۔ آپ کو یہ نام یاد ہوں گے، جیل کی پہاڑیاں، جی پی ٹی چوٹی، ایف۔ ایس۔ ڈی چوٹی، ہسپتال اور سب سے آخر ڈپٹی کمشنر کا بنگلہ۔ یہ بڑی سخت لڑائی تھی۔

مگر ہمارے آدمیوں نے، دشمن کی کہیں بھاری تعداد کے مقابلے میں، نہ صرف حملے کو روک دیا بلکہ آخر کار غنیم کو کچل کر ایک زبردست فتح حاصل کر دکھائی۔

یہ تھی کوہیما کی داستان۔ اس جنگ میں ہمارے نوجوانوں نے ثابت کر دیا کہ

ہم جاپانیوں کو ہرا سکتے ہیں۔ اور ہرا رہے ہیں۔



قومی جنگی محاذ نے شائع کیا